

تمکین کاظمی

پبلیشر : آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی ۔ حیدرآباد

مومن

حکیم مومن خاں مومن دہلوی کے حالات

اور

کلام کا تعارف

از

تمکین کاظمی

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
ACC NO 09004
MAILSI

مطبوعہ

انتخاب پریس

جواہر لال نہرو روڈ — حیدر آباد۔ اے پی

TECHNICAL SUPPORT
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

شایع کردہ: آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی - حیدر آباد

Masood Faisal Jhandir Library

فہرست

قیمت ـــــــــــ (۲ روپے)

مقدمہ

انیسویں صدی کے درمیانی حصہ کو اردو شعر و شاعری کے سنہرے دور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہی وہ زمانہ تھا جب کہ ذوقؔ مومنؔ اور غالبؔ جیسے باکمال شعرا دلی میں جمع ہو گئے تھے۔ یہ اردو شاعری کا "نقطۂ عروج" تھا۔ اسی دور میں اردو شاعری کو ایک نیا رنگ اور نیا آہنگ ملا، اس کی ایک وجہ وہ مسابقت بھی تھی جو شعرا کے درمیان جاری تھی۔ اپنے فن کو اعلیٰ سے اعلیٰ تر بنانے کی کوشش اور شعرا میں ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کی اسپرٹ نے جہاں اردو شاعری کو بہت کچھ دیا ہے وہیں اس نے ایک خرابی یہ بھی پیدا کی کہ ہر نامور شاعر کا ایک الگ گروہ بن گیا۔ کوئی گروہ ذوقؔ کے گن گاتا، کوئی غالبؔ کا طرفدار تھا تو کوئی مومنؔ کا ثنا خواں ۔۔۔ لیکن ذوقؔ اور غالبؔ اس اعتبار سے خوش قسمت رہے کہ انھیں محمد حسین آزادؔ اور حالیؔ جیسے شاگرد مل گئے، جنھوں نے بعد میں اپنے اپنے استادوں کے بھرپور تذکرے لکھے اور یوں حق شاگردی ادا کر دیا اس معاملہ میں مومنؔ کسی حد تک بدقسمت رہے۔ ان کی وضع داری اور خودداری ان کی شہرت کے راستے میں حائل رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعد کو ذوقؔ اور غالبؔ کی شہرت کے سامنے مومنؔ کی شہرت کسی حد تک ماند پڑ گئی۔ لیکن مومنؔ کا کلام خود ان کی عظمت اور شہرت کا ضامن ہے اور آج ہم اس موقف میں ہیں کہ دلی کے ان تینوں بڑے ہم عصر شعرا کے فن کا پوری غیر جانبداری کے ساتھ جائزہ لے سکیں۔

تمکین کاظمی مرحوم نے زیر نظر تصنیف "مومن" اسی خیال کے تحت لکھی تھی اور اس کا مقصد مومنؔ کی اس عظمت کو ظاہر کرنا ہے جو غالبؔ اور ذوقؔ کی شہرت کے باعث ماند پڑ گئی تھی۔ "مومن" تمکین کاظمی مرحوم کی آخری تصنیف ہے اور اس اعتبار سے بھی اس کی اہمیت مسلمہ ہے کہ یہ اردو کے ایک ممتاز محقق اور اہلِ قلم کا آخری علمی کارنامہ ہے۔

تمکین کاظمی مرحوم نے اپنی زندگی میں بے شمار کتابیں تصنیف کیں۔ لیکن زیرِ نظر تصنیف ان کی سالہا سال کی محنت اور کاوش کا نتیجہ ہے۔

سب سے پہلے انہوں نے ۱۹۲۸ء میں "مومن" پر تحقیقی کام شروع کیا تھا جو مختلف رکاوٹوں اور مزاحمتوں کے بعد بالآخر سنہ ۱۹۶۰ء میں تکمیل پا سکا۔ اس طرح تمکین کاظمی مرحوم کو تقریباً تیس بتیس برس تک مومن کے کلام کا جائزہ لینے اور ان کے حالاتِ زندگی جمع کرنے کا موقع ملا۔ یوں تو یہ کتاب ۱۹۵۷ء اور سنہ ۱۹۶۰ء کے درمیانی عرصہ میں لکھی گئی لیکن اس میں جو مواد اکٹھا کیا گیا ہے وہ کئی برسوں کی عرق ریزی کا حاصل ہے۔ اس طرح اس کتاب کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

تمکین کاظمی مرحوم نے ایک نئے انداز سے مومن کے کلام کا بھرپور جائزہ لیا ہے اور مومن کی زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جو ابھی تک تاریکی میں تھے۔ انہوں نے جس جانفشانی سے مومن کے حالاتِ زندگی جمع کیے ہیں قارئین اسے یقیناً پسند کریں گے۔ یہ اور بات ہے کہ مصنف اب اپنی محنت و کاوش کے صلہ یا سزا سے دور ہو چکا ہے۔ تمکین کاظمی اس کتاب کو سنہ ۱۹۶۰ء میں ہی طبع کروانے کے خواہشمند تھے لیکن زندگی نے وفا نہ کی۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی اردو کے اس ممتاز اہلِ قلم کے آخری علمی کارنامہ کو منظرِ عام پر لا رہی ہے اور اس کے لیے اکیڈمی مبارکباد کی مستحق ہے۔

مجھے امید ہے کہ تمکین کاظمی مرحوم کی اس کتاب کا اردو حلقوں میں شایانِ شان خیر مقدم کیا جائے گا اور اس سے اردو شاعری میں مومن کے مقام اور مرتبہ کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

حبیب الرحمٰن

دیباچہ

سلطنت مغلیہ نے کیسے کیسے انمول رتن پیدا کئے اور دلی نے کیسے دریتیم اپنے دامن میں سمیٹ لئے اس کا اندازہ کرنے کے لئے اس عہد کی آخری تاریخ کا مطالعہ کیجئے اسی اُلٹنے والی بساط کے ایک مہرے مومن خاں مومن بھی تھے جو بلحاظ ذہانت و علمیت اپنے ساتھیوں پر تفوق رکھتے تھے تو بلحاظ شاعری اُن سب سے بلند تھے۔

شاعر کی حیثیت سے دلی کے تین بزرگوں نے بڑی شہرت پائی مومن، غالب اور ذوق ہی نے اپنی خوش نوائی اور نغمہ سنجی سے نہ صرف دلی کو باغ و بہار بنا دیا بلکہ سارے ہندستان کو گلزار کر دیا، مومن اپنے دونوں ساتھیوں سے زیادہ خوش نوا خوش ادا اور خوش گفتار تھے معلوم نہیں کس کس کی نظر لگی کہ خوش رفتار بھی بن گئے اور سب سے پہلے جنت خرامی پر آمادہ ہو گئے اکاون باون برس کی عمر میں اللہ کو پیارے ہو کر ساتھیوں کے لئے شہرت و نام آوری کا میدان چھوڑ دیا، ان کی زندگی بھر غالب اور ذوق ان کے تحت الشعاع ہی رہے نہ تو مرزا غالب اُبھر سکے نہ ہی شیخ ابراہیم ذوق، مومن کے بعد ان دونوں نے بڑی شہرت حاصل کی مگر جو لوگ حقیقت شناس اور ذوق شعر و سخن رکھتے تھے وہ مومن ہی کا کلمہ پڑھتے رہے۔ شیخ ابراہیم ذوق نے بھی مومن کے بعد میدان خالی کر دیا اور مرزا غالب اکیلے اپنا ڈنکہ بجاتے رہے۔

غدر دہلی یعنے جدوجہد آزادی کے بعد جب محمد حسین آزاد نے مومن کی شہرت بدستور پائی تو انھوں نے اپنے استاد ذوق کو سب سے آگے بڑھانے کے خیال سے آب حیات لکھی اور مومن کو بالکل ہی چھوڑ دیا، البتہ غالب کو جگہ ضرور دی مگر ذوق سے نیچے ہی رکھا مرزا غالب کے ایک چہیتے شاگرد خواجہ حالی بھی تھے انھیں غالب کا اس طرح ٹھکرایا جانا بہت ہی ناگوار گزرا اس لئے انھوں نے سب سے پہلے مومن کے حالات مرتب کرکے آزاد کے پاس

بھجوا دیئے تاکہ دوسرے اڈیشن میں یہ حالات شامل ہوں تو غالب کے لئے راستہ صاف ہو سکے، چنانچہ آبِ حیات کے دوسرے اڈیشن میں مومن کے حالات شریک ہو گئے اور ذوق کی شہرت ذرا دھیمی ہونے لگی اب تو بچی کھچی شہرت بھی اِسے مٹانے اور غالب کو پوری طرح نمایاں کرنے کی خاطر انہوں نے یادگارِ غالب شائع کی،

دنیا مردہ پرست ہے مگر اُن ہی مُردوں کو پوجتی ہے جو بُت بنا کر پیش کئے جائیں جن کے مجسمے سامنے نہیں ہوتے اُن کو پوچھتی بھی نہیں اس لئے آزاد سے جو متاثر ہوئے وہ ذوق کو اور حالی نے جنھیں مرعوب کر دیا تھا وہ غالب کو پوجنے لگے آزاد کے بت خانے میں کئی لات و ہبل تھے اور حالی کے مندر میں صرف ایک سامری اس لئے زیادہ تر پرستش سامری ہی کی ہونے لگی اور لات و ہبل دھرے رہ گئے، اِن بھاری پتھروں کو چوم کر چھوڑنے کے بعد "عددِ سامری فن" کے "اعجاز رقم" کا چرچا اتنا بڑھا کہ ع۔

شامتِ اعمال ما صورتِ غالب گرفت!

غالب مومن اور ذوق پر غالب ہو گئے مگر ع۔

زہی چیزے دگر آماگی چیزے دگر!

مومن آخر مومن ہی تھا اس کے کلمہ گو اس کی رٹ لگاتے رہے اور کچھ نہ کچھ اس کے واسطے بھی ہوتا رہا اب دنیا بدل رہی ہے چشمِ بصیرت وا ہو رہی ہے ہر شخص اچھے بُرے کو پہچاننے لگا ہے، اس لئے مومن کی طرف رجحان بڑھتا جا رہا ہے اسی کا نتیجہ یہ کتاب بھی ہے جو آپ کے ملاحظہ میں ہے۔

ظہیر[۱] دہلوی آخری زمانے میں حیدر آباد آئے اور استاد داغ نے انھیں مہاراجہ کشن پرشاد آنجہانی کی سرکار میں نوکر رکھا دیا تو وہ حیدر آباد ہی میں رہ گئے، داغ کے

---

[۱] المتوفی ۱۹ ربیع الاول ۱۳۲۹ھ
۲۱ مارچ ۱۹۱۱ء

شاگردوں سے انھیں بہت خلوص تھا اور استاد ترکؔ قلندری پانی پتی سے بھی بڑی محبت تھی، چونکہ میرے والد حضرت تجلیؔ استاد داغؔ کے اُردو میں اور استاد ترکؔ کے فارسی میں شاگرد تھے اس لئے ظہیرؔ سے بھی خلوص اور یگانگت تھی، استاد ترکؔ روزانہ شام میں ہمارے دیوان خانہ میں تشریف لاتے تو ظہیرؔ بھی ساتھ ہی ساتھ آتے اور رات گئے تک محفل شعر و سخن گرم رہتی۔

یہ قصہ ہے ۱۹۱۰-۹ء کا جب کہ میری عمر نو دس سال کی تھی، ظہیرؔ عام طور پر ذوقؔ، مومنؔ، غالبؔ کے قصے سناتے اور پرانی دلی کا ذکر کرتے رہتے تھے چونکہ وہ مومنؔ کے نہ صرف معترف و مداح بلکہ متبع بھی تھے، اس لئے مومنؔ کے شعر سناتے اور اشعار کی شرح بھی کرتے رہتے تھے، میں بھی دیوان خانہ میں پہنچ جاتا تو ایک کونے میں بیٹھ کر ایک آدھ قصہ سن لیتا یا دو چار شعر آویزۂ گوش ہو جاتے، چنانچہ مومنؔ کے بیشتر شعر ظہیرؔ سے سن کر میں نے یاد کر لئے تھے، جب ذرا شعور آیا اور بیت بازی کا شوق ہوا تو مومنؔ کے دیوان کا مطالعہ بھی نصیب ہوا، اور اکثر شعر اس سلسلہ میں یاد ہو گئے، مگر جب بیت بازی چھوٹی تو میں مومنؔ کو بھول گیا۔

۱۹۲۴ء میں ماہنامہ تاج حیدرآباد میں مہدی علی شہیدؔ (نواب شہید یار جنگ) نے مومنؔ کے بعض اشعار کے سلسلہ میں استفسار کیا تھا کہ یہ سمجھ میں نہیں آتے چنانچہ ان اشعار کو حل کرنے کے بعد ان اشعار کا مطلب بھی سمجھایا اور پھر میں نے جہاں تک میری سمجھ کام دے سکی مومنؔ کو حل کرنا شروع کیا مگر ملازمتی مصروفیتوں کی وجہ سے کام ادھورا چھوڑنا پڑا۔

۱۹۲۸ء میں ماہنامہ نگار کا مومنؔ پر ایک خاص نمبر نکلا تو مجھے مومنؔ پر کام کرنے کا خیال پیدا ہوا اور میں نے مواد فراہم کرنا شروع کر دیا، محبی نیاز فتحپوری نے انشائے مومنؔ کا ایک نسخہ فراہم کر دیا اور مکرمی پروفیسر ضیاء احمد (علیگڈھ) نے مومنؔ کے فارسی دیوان کی نقل علیگڈھ سے دلوا دی مگر مواد کی کمی اور بعض نایاب تذکروں کی عدم میسری کی وجہ سے میں نے اس مواد کو محفوظ کر دیا، میرا خیال یہ تھا کہ ذرا سہولت ہو تو اس سلسلہ میں دہلی،

رامپور اور علیگڈھ کا دورہ کر کے منتشر مواد فراہم کر لوں مگر حالات سازگار نہ ہوئے' اور یہ پشتارہ پڑا پڑا دیمک کی نذر ہو گیا'

۱۹۵۷ء میں مجھے اپنی عمر کے پچپن سال پورے کرنے کے بعد وظیفہ پر سبکدوش ہونا پڑا' تو میں نے اطمینان کے ساتھ کام کرنے کے خیال سے فراہم شدہ مواد کا پشتارہ جو کھولا تو دیکھتا کیا ہوں کہ آدھے سے زیادہ کاغذات دیمک نے صاف کر دیئے ہیں اس لئے دوبارہ پھر وہی مواد فراہم کرنا پڑا'

قلب کا لگاؤ' دمہ اور تبخیر معدہ جیسے موذی عوارض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے میں نہ تو حیدرآباد سے نکل سکتا ہوں اور نہ حیدرآباد ہی میں گھوم پھر سکتا ہوں' خانہ نشین اور گوشہ گزیں رہ کر کسی تحقیقی مقالے کی تکمیل جتنی مشکل ہے آپ غور کریں' مگر باوجود ان موانعات کے ایک مستقل کتاب میں نے مرتب کر لی ہے اور جس قدر مواد منتشر تھا فراہم کر لیا ہے اس کے لیے اپنے مخلص دوستوں کا ممنون اور شکر گزار ہوں کہ انھوں نے فراہمیٔ مواد میں بڑی امداد اور اعانت کی۔

تمکین کاظمی

خاندان

دولت مغلیہ رو بہ زوال تھی اور شعلۂ مستعجل بجھنے کے لئے بھڑک رہا تھا کہ دلی پھر ایک بار اہلِ علم اور فن کاروں کا مرکز بننے لگی۔ اسی زمانے میں کشمیر سے حکیم نامدار خاں جو وہاں کے شرفا و اور نجبا سے تھے دہلی آئے اور انھیں شاہ عالم (۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء) نے طبیب شاہی مقرر کیا اور موضع بلاہہ وغیرہ پرگنۂ نارنول میں جاگیر سرفراز کی۔[1]

جب سرکار انگریزی نے ریاست جھجر نواب فیض طلب خاں کو دی تو پرگنۂ نارنول بھی اس میں شامل تھا اس لئے فیض طلب خاں نے اس جاگیر کے معاوضے میں سالانہ ایک ہزار روپے پنشن مقرر کردی۔[2]

حکیم نامدار خاں نے کئی بیٹے بیٹیاں یادگار چھوڑیں جن میں سے ایک حکیم غلام نبی خاں بھی تھے جو اپنے والد کی پنشن پاتے اور دلی کے مشہور اطبا میں شمار ہوتے تھے۔[3]

چونکہ حکیم نامدار خاں نے دلی پہنچ کر چیلوں کے کوچے میں مکان بنالیا تھا اس لئے اسی مکان میں حکیم غلام نبی خاں بھی رہتے تھے۔[4]

---

۱ تا ۴ آب حیات ص ۳۵۴

ولادت

۱۲۱۵ھ ۱۸۰۱ء میں حکیم غلام نبی خاں کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا چونکہ حکیم صاحب شاہ عبدالعزیزؒ کے ارادت مند تھے اور شاہ صاحب کا مدرسہ بھی کوچۂ چیلان ہی میں تھا اس لئے انہوں نے شاہ صاحب کو زحمت دی اور شاہ صاحب نے اس نومولود کے کان میں اذاں کہی[۵]

نام

شاہ عبدالعزیزؒ نے اس نومولود کا نام محمد مومن خاں تجویز فرمایا مگر دہلی کے شرفا چونکہ اس قسم کے نام کو ناپسند کرتے تھے اس لئے خاندان والوں نے حبیب اللہ خاں نام رکھ دیا مگر حبیب اللہ نام تو والی کابل کے لیے مقرر ہو چکا تھا اس لئے شاہ صاحب کی زبانِ فیض ترجمان سے نکلا ہوا نام مومن خاں ہی ملک سخن کا سکہ بنا[۶]

مومن کے خاندان سے متعلق سوا آبِ حیات کے کسی اور تذکرے میں کوئی اندراج نہیں ملتا' آبِ حیات میں بھی صرف اتنا ہی لکھا ہے کہ

"اِن کے والد حکیم غلام نبی خاں ولد نامدار خاں شہر کے شرفا میں سے تھے" (ص ۵۲۲)

پھر اس کی توضیح یوں کی ہے کہ

"جن کی اصل نجبائے کشمیر سے تھی اول حکیم نامدار خاں اور کامدار خاں دو بھائی سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں آکر بادشاہی طبیبوں میں داخل ہوئے" (ص ۵۲۳)

اس کے علاوہ اور کوئی اندراج خود آبِ حیات میں بھی نہیں' اس اندراج سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ مومن کے اجداد کشمیر کے شرفا سے تھے اور ابتداً حکیم نامدار خاں اور کامدار خاں دلی پہنچے' کامدار خاں کا حال کسی تاریخ یا تذکرے میں نظر نہیں آتا نہ ہی آبِ حیات میں کہیں یہ نام دوبارہ آیا ہے البتہ نامدار خاں کا نام دوبارہ اس طرح آیا ہے کہ

۵۔ ۶۔ آبِ حیات ص ۴۳۶'

شاہ عالم کے زمانہ میں موضع بلاہیڑہ وغیرہ پرگنہ نارنول میں جاگیر پائی جب سرکار انگریزی نے جھجر کی ریاست نواب فیض طلب خاں کو عطا فرمائی تو پرگنہ نارنول بھی اس میں شامل تھا' رئیس مذکور نے ان کی جاگیر ضبط کر کے ہزار روپیہ سالانہ پنشن ورثہ حکیم نامدار خاں کے نام مقرر کر دی پنشن مذکورہ سے حکیم غلام نبی خاں صاحب نے اپنا حصہ لیا' اور اس میں سے حکیم مومن خاں نے اپنا حق پایا" (صـ ۵۲۳)

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکیم نامدار خاں کو حکیم غلام نبی خاں کے علاوہ بھی اولاد تھی مگر اس کی تفصیل کہیں نظر نہیں آتی کہ کتنے بیٹے بیٹیاں تھیں البتہ اسی سابقہ اندراج کے سلسلہ میں آب حیات میں لکھا ہے کہ:

"اس کے علاوہ اس کے خاندان کے چار طبیبوں کے نام پر سو روپیہ ماہوار پنشن سرکار انگریزی سے بھی ملتی تھی اس میں سے ایک چوتھائی اِن کے والد کو اور اُن کے بعد اس میں سے ان کو حصہ ملتا رہا" (صـ ۵۲۳)

اس طرح آزاد نے گویا چار طبیبوں کا ذکر کیا ہے اور ان میں سے دو کا نام مومن کی طبی تعلیم کے سلسلہ میں اس طرح لیا ہے کہ:-

"جب عربی میں کسی قدر استعداد ہو گئی تو والد اور چچاؤں' حکیم غلام حیدر خاں اور حکیم غلام حسن خاں سے طب کی کتابیں پڑھیں اور انھیں کے مطب میں نسخہ نویسی کرتے رہے"۔ (صـ ۵۲۴)

اس طرح آب حیات کے توسط سے ہمیں مومن کے والد غلام نبی خاں اور دو چچاؤں غلام حیدر خاں' اور حسن خاں کے نام ملتے ہیں'

سرسید نے ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء میں دہلی کی تاریخ "آثار الصنادید" مرتب کی اس کے باب چہارم میں "تذکرۂ اہل دہلی" بھی شریک کر دیا' اس حصے میں سرسید نے زیادہ تر ان لوگوں کے حالات لکھے ہیں جو ان کے دوست یا ملاقاتی تھے' غیر واقف لوگوں کا ذکر کیا ہی نہیں ہے' چونکہ سرسید حکیم حیدر خاں کے شاگرد تھے اس لئے انہوں نے حکیم غلام حیدر خاں (صـ ۹۴) اور حکیم غلام حسن خاں (صـ ۱۰۱) کا ذکر

کرنے سے علاوہ حکیم غلام حسن خاں کے دو بیٹوں حکیم محمد یوسف خاں اور حکیم عبدالحکیم خاں معروف بہ ابو خاں (ص۱۵) کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ مگر اس میں مومن خاں کی قرابت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

مومن کے خطوط (انشائے مومن) میں ایک خط اُن کے چچا حکیم غلام حسین خاں کے نام بھی ہے جو ۱۲۳۸ھ کے گرد و پیش کا لکھا ہوا ہے۔ حکیم غلام حسین خاں حیدرآباد میں ابتداً فوج اور پھر عدالت کے محکموں میں رہے اور ۱۲۵۸ھ تک ان کی موجودگی ثابت ہے (گلزار آصفیہ ص ۱۴۰-۱۴۱)

مومن خاں کے دو شجرے مجھے ملے ہیں ایک مرزا فرحت اللہ بیگ سے اور ایک ناصر وزیر سے، ناصر وزیر والے شجرے میں مومن خاں کی اولاد کی تفصیل ہے اجداد کی نہیں، البتہ مرزا فرحت اللہ بیگ کے پاس کا شجرہ ایسا ہے جس میں نامدار خاں کا مدار خاں کے نام ہیں اور نامدار خاں کے تین بیٹوں ۱۔غلام نبی خاں، ۲۔غلام حیدر خاں، ۳۔غلام حسین خاں اور دو بیٹیوں ۱۔عائشہ بیگم، ۲۔مبارک النساء بیگم اور ان کی اولاد پر مشتمل ہے، چونکہ اس شجرے میں حکیم غلام حسن خاں کا نام نہیں ہے اس لیے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ غلام حسن خاں ہی کو غلام حسین خاں لکھا گیا ہوگا، مگر اس میں غلام حسین خاں کی اولاد کی تفصیل بھی ہے جو ۱۔میر عبداللہ، ۲۔میر عبدالرحیم، ۳۔عبدالرحمٰن، ۴۔عبدالکریم، ۵۔جہانگیر بیگم، ۶۔الٰہی بیگم پر مشتمل ہے، چونکہ اس میں حکیم غلام حسن خاں کے بیٹوں حکیم محمد یوسف خاں اور حکیم عبدالحکیم خاں عرف ابو خاں کے نام جو سر سید کی روایت کردہ ہیں موجود نہیں ہیں، اس لیے ہم قطعیت کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ غلام حسین خاں مستقل شخص ہیں، غلام حسن خاں کی تحریف نہیں ہے، اس طرح ہم کو حکیم نامدار خاں کے چار بیٹوں، ۱۔غلام نبی خاں ۲۔غلام حیدر خاں، ۳۔غلام حسن خاں، ۴۔غلام حسین خاں کے نام مل جاتے ہیں، اور آبِ حیات کا یہ بیان کہ اس خاندان کے چار طبیبوں کو سرکارِ انگریزی سے پنشن

ملتی ہے، صحیح معلوم ہوتا ہے،

انشائے مومن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم احسن اللہ خاں مومن کے پھپی زاد بھائی تھے اور ان کی والدہ مومن کی پھپی تھیں، مومن کے تعلقات احسن اللہ خاں سے اس قرابت کی تصدیق بھی کرتے ہیں اور خود احسن اللہ خاں نے بھی انشائے مومن کے دیباچے میں اعتراف کیا ہے، مگر حیرت ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کے شجرے میں مومن کی دو ہی پھپیوں کے نام ہیں، ایک عائشہ بیگم جو مرزا قاسم علی بیگ غزنوی ولد مرزا بیگ غزنوی سے بیاہی گئی تھیں، جو چوتھی پشت میں فرحت اللہ بیگ کی دادی ہوتی تھیں اور دوسری مبارک النساء بیگم جن کے شوہر کا نام نہیں لکھا گیا ہے، بلکہ ان کی بیٹی اللہ جلائی بیگم کا نام لکھا گیا ہے جو لا ولد تھیں،

معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح فرحت اللہ بیگ والے شجرے میں حکیم غلام حسن خاں کا نام چھوٹ گیا اسی طرح مومن کی ایک پھپی کا نام بھی چھوٹ گیا ہے، جو حکیم عزیز اللہ صدیقی سے بیاہی گئی تھیں، جن کے بطن سے حکیم احسن اللہ خاں تھے۔

اس طرح حکیم نامدار خاں کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں قرار پاتی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے، بیٹے۔ حکیم غلام نبی خاں، حکیم غلام حیدر خاں، حکیم غلام حسن خاں حکیم غلام حسین خاں،

بیٹیاں۔ عائشہ بیگم، مبارک النساء بیگم، والدہ حکیم احسن اللہ خاں،

آبِ حیات میں مومن کے حالات خواجہ حالی کے بھجوائے ہوئے ہیں جو ۱۸۸۴ء میں مرتب ہوئے ہیں، کیونکہ آزاد نے مومن کے شاگردوں کا ذکر کرتے ہوئے نواب اکبر خاں (برادر مصطفیٰ خاں شیفتہ) کے نام کے ساتھ لکھا ہے کہ "چار برس ہوئے راول پنڈی میں انتقال کیا" (صفحہ ۵۲۶) چونکہ نواب اکبر خاں نے ۱۸۸۰ء میں انتقال کیا ہے اس لئے یہ حالات ۱۸۸۴ء کے مرتبہ ہیں چونکہ بہت پہلے حکیم غلام حسین خاں حیدرآباد جا چکے تھے اور

غدر کے بعد حکیم احسن اللہ خاں دہلی میں بہت بدنام ہو چکے تھے اور لوگ ان کا نام لینا بھی پسند نہ کرتے تھے، اس لئے ان دونوں ناموں کو ممکن ہے کہ خواجہ حالی نے عمداً نظر انداز کر دیا ہو یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سہواً ایسا ہوا ہو، حکیم غلام حسین خاں چونکہ ۱۲۶۳ھ سے پہلے حیدرآباد جا چکے تھے اس لئے ممکن ہے کہ خواجہ حالی ان سے واقف ہی نہ ہوں مگر احسن اللہ خاں سے وہ بہت واقف تھے اور غالب کے تعلق سے ان کے تعلقات احسن اللہ خاں سے تھے، اور وہ مومن کی قرابت سے واقف تھے، ان کا ذکر کسی مصلحت ہی سے حالی نے نہیں کیا ہے۔

یہ ہماری تحقیق کا خلاصہ ہے، اس سے زیادہ تحقیق فی الحال نہیں ہو سکتی کیونکہ کوئی مواد ہی ہمارے سامنے نہیں ہے، رہا مومن کا خاندان سو اس کے متعلق معتبر تذکرے معترف ہیں کہ مومن کے اجداد کشمیر کے شرفا سے تھے، چنانچہ شیفتہ نے گلشن بے خار میں لکھا ہے کہ:-

"از دودمان گرامی و از خاندان نامی است" (ص ۱۹۵)

قرش گیانی نے حیات مومن میں مومن کو سادات علویہ میں شمار کیا ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، مومن کے کلام سے ظاہر ہے کہ وہ سید نہیں تھے، چنانچہ ایک "نامۂ منظوم" میں انہوں نے کہا ہے[۵]

تو جو ہے ہاشمی نسب اے جان ؛ ہے محبت تری مرا ایمان

اگر وہ ہاشمی النسل ہوتے تو یہ شعر ان کے قلم سے ہرگز نہیں نکلتا،

مومن کی شادی خواجہ محمد نصیر کی بیٹی سے ہونے کی وجہ سے بھی انھیں سید بنانے کی کوشش بعض لوگوں نے کی ہے، مگر یہ کوئی اہم بات یا سیادت کی دلیل نہیں ہے سیدوں کی لڑکیاں[۱] عام طور پر شیخوں کو دی جاتی رہی ہیں چونکہ مومن شیخ تھے اس لئے خاندان خواجہ میر درد کی لڑکی کا ان سے بیاہی جانا علویت کی دلیل نہیں ہے، یہ غلط فہمی نامہ حبیب کی پھیلائی ہوئی ہے جو مومن کے نواسے تھے، مگر وہ خود مومن کے خاندان اور اجداد سے ناواقف تھے، اب یہ بحث فضول ہے کہ مومن سید تھے یا شیخ مغل تھے یا پٹھان البتہ ان کے خاندان کے متعلق بحث کی جا سکتی ہے کہ وہ شرافت خاندانی یا شرافت نسبی رکھتے تھے یا نہیں، مومن کے معاصرین اور

متاخرین نے ان کی شرافت اور خاندانی بزرگی کا اعتراف کیا ہے' اس لئے ان کی شرافت اور نجابت مسلمہ ہے۔

مومن نے اپنے کلام میں بھی اپنے خاندان کے متعلق اشارے کئے ہیں چنانچہ پہلی مثنوی میں لکھا ہے کہ جب ان کی عاشقی کا قصہ گھر والوں کو معلوم ہوا تو ان لوگوں نے ڈانٹا سے

عزت و شان خاندان کو دیکھ ؎ جاہ ہم اوج آسمان کو دیکھ

انشائے مومن میں بھی اپنے خاندان کی بزرگی اور اپنی نسبی برتری جگہ جگہ ظاہر کی ہے۔

تعلیم

مومن کی تعلیم سے متعلق آبِ حیات میں لکھا ہے کہ

"بچپن کی معمولی تعلیم کے بعد جب ذرا ہوش سنبھالا تو والد نے شاہ عبدالقادر صاحب کی خدمت میں پہنچایا' ان سے عربی کتابیں پڑھتے رہے' حافظہ کا یہ حال تھا کہ جو بات شاہ صاحب سے سنتے تھے فوراً یاد کر لیتے تھے اکثر شاہ عبدالعزیز صاحب کا وعظ ایک دفعہ سن کر بعینہ ویسا ہی ادا کرتے تھے' جب عربی میں کسی قدر استعداد ہو گئی تو والد اور چچا حکیم غلام حیدر خاں اور حکیم غلام حسن خاں سے طب کی کتابیں پڑھیں اور انھیں کے مطب میں نسخہ نویسی کرتے رہے"[1]۔

کریم الدین نے طبقات الشعراء میں لکھا ہے'

"حال استعداد کا ان کی یہ ہے کہ عربی شرح ملا تک اور فارسی خوب جانتے ہیں اور طب میں بھی مہارت ہے"[2]۔

ان دونوں تذکروں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مومن نے بالکل معمولی عربی پڑھی تھی بقول آبِ حیات "کسی قدر استعداد ہوتے ہی طب پڑھنے لگے اور کسی قدر استعداد کی وضاحت کریم الدین نے کر دی کہ

---

[1] آبِ حیات ص ۴۳۶' [2] طبقات الشعراء ص ۴۴۳

"شرح ملا" تک عربی پڑھی تھی۔

مومن نے اپنی مثنوی میں آٹھ نو برس کی عمر سے عشق و محبت میں گرفتار ہونا ظاہر کیا ہے، جس سے لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ مومن نے آٹھ نو سال کی عمر تک جو کچھ تعلیم پائی وہی ان کا سرمایۂ علم رہا اس کے بعد سے وہ تعلیم چھوڑ کر عشق و عاشقی کے چکر میں پھنس گئے۔

بظاہر یہ خیال درست بھی معلوم ہوتا ہے مگر مومن کا فارسی کلام اور ان کے خطوط ان کی فارسی اور عربی قابلیت کے گواہ ہیں اور پھر کریم الدین نے "عربی شرح ملا تک اور فارسی خوب جانتے ہیں" لکھ کر پریشانی میں اضافہ کر دیا ہے، کیونکہ کسی نے بھی مومن کے فارسی پڑھنے کا ذکر نہیں کیا ہے، آبِ حیات نے بھی عربی تعلیم کا ذکر کیا ہے اور طبقات الشعرا نے بھی، پھر فارسی انھیں کس طرح آگئی، یہ بڑی حیران کن بات ہے،

مومن نے اپنی پہلی مثنوی میں لکھا ہے کہ ؎

تھے برس ہم شمارۂ افلاک ۞ کہ ہوا پائمال صورتِ خاک

اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ بچپن ہی میں بگڑ گئے تھے، مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی لکھ دیا ہے کہ ان دنوں مشغلہ یہ تھا کہ

حفظِ قرآن و یادِ مصحف رو ۞ فرصت اک دم نہ روز و شب میں کبھو

دن کو وردِ زباں سبق ناچار ۞ رات کو درسِ شوق کی تکرار

بلکہ اسی زمانے میں انھوں نے شاعری بھی شروع کر دی تھی ؎

شوق کو مشق نالۂ موزوں ۞ باندھتا تھا میں دلکشا مضموں

اس مثنوی کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مومن عاشقی بھی کرتے تھے کلامِ مجید بھی حفظ کرتے تھے، دوسری کتابوں کا سبق بھی یاد کرتے اور شاعری بھی کرتے تھے، اس طرح انھوں نے کئی کام بیک وقت کئے ہیں۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کا مدرسہ چھوڑنے کے بعد مومن کی عربی فارسی تعلیم

علمی تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ ہوتی رہی اور وہ اپنی ذہانت اور تیزی کی وجہ سے عاشقی کے ساتھ اِن کاموں کو بھی کرتے رہے اور یہ سلسلہ مدتوں جاری رہا، چنانچہ اعظم الدولہ سرور نے اپنے تذکرہ عمدہ منتخبہ میں لکھا ہے۔

"حافظ محمد مومن نوجوانے است ہمت بر تحصیل کتب عربی مصروف دارد، اصلش از خطہ کشمیر، مولدش دار الخلافہ شاہ جہان آباد اجدادش بعزت و عمدگی بسر بردند، روئیہ شعر گوئیش بسیار مطبوع شخص بسیار خلیق است"[۱]

عمدہ منتخبہ کی ترتیب ۱۲۱۵ھ سے ۱۲۴۳ھ تک قرار دی گئی ہے چونکہ ۱۲۱۵ھ میں مومن پیدا ہوئے ہیں اور سرور نے انھیں نوجوان اور روئیہ شعر گوئیش بسیار مطبوع لکھا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حالات سرور نے ۱۲۴۰ھ کے گرد و پیش میں لکھے ہیں کیونکہ اس وقت مومن کی عمر ۲۴، ۲۵ برس کی تھی اور وہ بہ حیثیت شاعر خاصے مشہور ہو چکے تھے۔

سرور کے تذکرے سے نئی باتیں یہ معلوم ہوتی ہیں کہ

مومن حافظ تھے، نوجوان تھے، عربی کی تحصیل میں مصروف تھے، اچھے شاعر تھے، خلیق تھے۔

مومن کے اخلاق اور شاعری سے متعلق تو اور تذکرہ نویس بھی متفق ہیں مگر ان کی تحصیل کتب عربی اور حفظ کلام اللہ کا ذکر سوا سرور کے کسی اور نے نہیں کیا ہے۔

مومن کا حافظ ہونا نہ صرف نئی بات بلکہ انوکھی بات معلوم ہوتی ہے کیونکہ نہ تو شیفتہ نے ان کے حفظ قرآن کا ذکر کیا ہے نہ کریم الدین نے نہ حالی نے (آب حیات کو حالات مرتب کر کے بھیجتے ہوئے) نہ اور کسی تذکرہ نویس نے۔

اب یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اگر مومن حافظ تھے تو سرور کے علاوہ کسی اور نے

---

[۱] عمدہ منتخبہ ص ۵۷۸

کیوں نہیں لکھا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے شرفا اور علماء اکثر حافظ ہوتے تھے مگر اپنے نام کے ساتھ حافظ لکھتے تھے نہ اپنے حفظ کی شہرت دیتے تھے، اپنے آپ کو حافظ مشہور کرنے والے یا تو کم سواد اور کم حیثیت لوگ ہوتے یا پھر پیشہ ور قرآن خوان جو مساجد میں تراویح پڑھانے کی خاطر اپنا اشتہار دیا کرتے تھے، یہ طریقہ، دہلی، ٹونک، دکن ہر جگہ عام تھا جہاں کے شرفا اور اہل علم اکثر حافظ تھے مگر ان کے نام کے ساتھ حافظ لکھا جاتا تھا نہ لوگ ان کے حفظ سے واقف تھے، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ یقیناً اس سے واقف ہوں گے مگر وہ اس کے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے کیونکہ وہ مومن کی شاعری ہی کو ان کے مرتبہ سے کم سمجھتے تھے چنانچہ لکھا ہے "ہر چند نظر بکمالات متنوعہ شاعری دون مرتبہ اوست"[۵] اسی وجہ سے شیفتہ نے مومن کو حافظ نہیں لکھا، اور چونکہ مومن نے اپنے حافظ ہونے کی شہرت نہیں دی تھی اس لئے کریم الدین اس سے واقف ہی نہ تھے،

اعظم الدولہ سرور مولف عمدۂ منتخبہ مومن کے بزرگوں کے ملنے والے ہوں گے اور مومن سے زیادہ واقف ہوں گے اس لئے انہوں نے حافظ لکھ دیا ہے،

غرض مومن کا حافظ اور عربی فارسی زبانوں کا ماہر ہونا مسلم ہے اس کی مزید تصدیق مومن کی طبی تعلیم سے بھی ہوتی ہے کیونکہ گزشتہ پچاس برس تک بھی طب یونانی کا پورا نصاب عربی ہی تھا، صرف دو ایک کتابیں فارسی تھیں چنانچہ حیدرآباد کے مدرسۂ طبیہ کے نصاب سے میں ذاتی طور پر واقف رہا ہوں جو سوا دو کتابوں کے بقیہ پورا نصاب عربی ہی تھا، اور کوئی مبتدی اس نصاب کو پڑھ ہی نہ سکتا تھا اس سے ظاہر ہے کہ مومن عربی کے فاضل نہ سہی ماہر ضرور تھے۔

اس نوبت پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مومن نے عربی سے ناواقفیت کی وجہ سے طب پڑھی نہیں ہوگی

---

[۵] گلشن بے خار ص ۱۹۵

بلکہ مبادیات سے واقف ہو کر نسخہ نویسی کرنے لگے ہوں گے، مگر یہ قرین عقل نہیں ہے کیونکہ اس زمانے میں علمِ طب ایک علم تھا جو پڑھایا جاتا تھا فنِ طب بنا کر اُسے اردو دانوں اور فارسی خوانوں کو نہیں سکھایا جاتا تھا یہ طریقہ بہت بعد شروع ہوا اور غیر عربی داں طبیب یونانی بن گئے مگر یہ لوگ طبیب کہلاتے تھے حکیم نہیں کہلاتے تھے اس لئے ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ مومن نے عربی میں طب پڑھی ہے اور عربی میں طب اسی وقت پڑھی جا سکتی تھی جب زبان پر کامل عبور ہو،

یہ بحث ضمنی اور قیاسی تھی کیونکہ کوئی ثبوت ہمارے سامنے نہیں مگر مومن کے قصائد اور ان کی مثنویاں اور تاریخیں ان کی عربی دانی کی گواہ ہیں، مومن نے شعر تو عربی میں کم کہے ہیں مگر مصرعے بہت کہے ہیں اور عربی فارسی ترکیبیں تو انہوں نے لاکھوں استعمال کی ہیں، عربی میں شعر یا مصرعے اسی وقت کہے جا سکتے ہیں جب زبان پر پورا پورا عبور ہو ورنہ معمولی عربی داں اور عربی میں شعر تو کیا مصرع بھی موزوں نہیں کر سکتا، چونکہ مومن عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے اس لئے انہوں نے ایک سانس میں تینوں زبانوں میں شعر کہے ہیں۔

مومن کی تیسری مثنوی قول غمیں سے آخری چار شعر ہمارے قول کی صداقت کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں،

مومنِ زار کہ تھا گرم بیاں | سوزشِ سینہ سے تھا شعلہ فشاں
دل کی آتش سے جلا خاک ہوا | بجھ گیا شعلہ بھڑک کر دل کا
آتشیں نالہ زدو رفت ز ہوش | ہمچو شمع سحری گشت خموش
ختم المومن نوحاً حزناً | ختم اللہ لہ بالحسنیٰ

دیکھ لیا آپ نے مومن اردو مثنوی کہتے کہتے فارسی پر اتر آتے ہیں اور پھر عربی شعر کہنے لگتے ہیں،

اسی طرح چوتھی مثنوی تفِ آتشیں میں بھی کہا ہے ؎

طال حدیث العشق فاقصر | اتلفنا ولو الک صبر

مومن کے قصائد میں یہ گلکاری بہت نمایاں ہے، پہلا قصیدہ ملاحظہ ہو ؎

الحمد لواہب العطایا اس شور نے کیا مزا چکھایا
والشکر نصائح البریۃ جس نے ہمیں آدمی بنایا
اللہ دکھا دے اپنا دیدار اکشف بجمالک الغطایا
سبحانک یا الٰہ عالم عالم ترا عجز نے دکھایا

اس قصیدہ میں تو چار مصرعے عربی ہیں اور دوسرے اشعار میں عربی ترکیبیں اور عربی الفاظ ایسی عمدگی سے لائے گئے ہیں کہ جی لوٹ جاتا ہے، یہ کام کوئی غیر عربی داں کر ہی نہیں سکتا۔

وہ سیر آسمان تقدیس جاں سوز مناظر و مرایا
گو وصف ہے یؤمنون بالغیب پر بندہ تو اس سے باز آیا
لا علم لنا ہے یاد ہر چند سب کچھ مجھے عجز نے بھلایا
تھا دھیان میں عذر لا نحیطون جب سینے میں دم ذرا سمایا
کیا صعب گزار ہے رہ حمد جبرئیل کا پاؤں لڑکھڑایا
مرغان دراز اجنحہ کو اس اوج نے خاک پر گرایا
تھا شور فداک جلے لبیک اِس دشمنِ دین نے گر بلایا
گل پیرہنوں کی آرزو نے اگر خز و پرنیاں پہنایا
ہے عام خطاب یا عبادی اس نے تو کچھ آسرا بندھایا
عالم میں نہ ہووے گا وگرنہ مجھ سا کوئی منکر السجایا
اس دام سے مجھ کو تو چھڑا دے داؤد نے جس میں دل پھنسایا
وہ نعرۂ علمہ بحالی جس نے اس آگ کو بجھایا

ان اشعار میں کلام مجید کی آیات اور احادیث قدسیہ کی طرف اشارے ہیں۔ بعض تلمیحات بھی ہیں جن سے مومن کی معلومات کا اظہار ہوتا ہے، مثلاً اس دام سے چھوٹنے کی دعا جس میں داؤد نے دل پھنسایا تھا یہ تلمیح ہے اسرائیلی خرافیات کی، اسرائیلیوں نے

نے اپنے فرضی قصوں میں یہ بھی مشہور کر رکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے لشکر کے ایک سپاہی کی بیوی پر عاشق ہو کر اس سپاہی کو جہاد پر بھیج دیا تھا، اور جب وہ سپاہی جہاد میں شہید ہو گیا تو آپ نے اس عورت سے عقد کر لیا۔ یہ بالکل فرضی اور من گھڑت قصہ ہے۔ قرآن شریف میں اس کا ذکر نہیں ہے، صرف اسرائیلی ادب میں اس کا وجود ہے جو عربی زبان میں منتقل ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ مومن نے اس قصے کو عربی ہی میں پڑھا ہے، یہ اور اسی قسم کی دوسری تلمیحیں مومن کی عربی دانی کی گواہ ہیں،

اردو کا دوسرا قصیدہ جو نعت میں ہے وہ عربی قوافی کی وجہ سے خاصا ادق ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ مومن کو عربی ادب اور لغت پر پورا پورا عبور تھا، معمولی صلاحیت کا شخص یا مبتدی جس نے شرح ملا تک تعلیم پائی ہو ان قوافی کو اس عمدگی سے استعمال نہیں کر سکتا۔ علاوہ ازیں طبی مصطلحات بھی اس میں آئی ہیں، یہ بھی یاد رہے کہ نجوم بھی ان دنوں عربی ہی میں پڑھایا جاتا تھا، ہندو منجم سنسکرت میں اور مسلمان منجم عربی فارسی میں نجوم پڑھایا کرتے تھے، کوئی نجوم کی کتاب اردو زبان میں تھی ہی نہیں۔

مومن نے مصطلحات نجوم عربی ہی میں استعمال کئے ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے عربی ہی میں نجوم پڑھی ہے اگر وہ ہندو جوتشیوں سے نجوم سیکھتے تو جوتش کی سنسکرت اصطلاحات ان کی زبان پر ہوتیں۔

مومن کے اردو قصائد میں تیسرا چوتھا پانچواں اور چھٹا قصیدہ اشارات، تلمیحات استعارات اور تشبیہات سے بھرے ہوئے ہیں آخری دو قصیدے بھی ایسے ہی ہیں مگر کم ادق ہیں۔ اگر کوئی شخص مومن کے اردو، فارسی قصائد کا حل اور ان کے اشارات تلمیحات، محاورات اور لغات کو حل کر کے ان کی شرح لکھے تو ایک بسوط کتاب بن سکتی ہے، مگر ابھی اردو زبان اس قابل نہیں ہوئی ہے توقع ہے کہ چند سال بعد یقیناً یہ کام بہ احسن الوجوہ ہوگا۔

مومن نے اپنے دیوان کی ترتیب کے وقت قصائد، مسدسات، تاریخات وغیرہ کے

عنوانات بھی عربی آمیز اردو میں لکھوائے ہیں اور مادہ ہائے تاریخ بھی بیشتر عربی، فارسی آمیز ہی نکالے ہیں، چنانچہ نمونتہً چند نقل کرتا ہوں،

وفات جدہ مومن سراپا غم دخلت اللہ فی جنت النعیم،

عنوان ہے اور مادہ تاریخی ہے دخلت بالنعیم

اپنے والد حکیم غلام نبی خاں کی وفات کی تاریخ لکھی ہے،	قد فاز فوزاً عظیماً
نواب تفضل حسین خاں کی شادی کی تاریخ لکھی ہے،	اجتماع شمس وقمر
عباس علیخاں کے عقد کی تاریخ لکھی ہے،	قران السعدین
اشرف الدولہ کی ضریح کا مادہ تاریخی ہے،	ضریح اطہر
نواب عبد اللہ خاں کے باغ کی تاریخ لکھی ہے،	جنتہ من نخیل
خواجہ خلیل اللہ کے ختنہ کی تاریخ لکھی ہے،	سنت خلیل اللہ
ماہ خانم کی وفات کی تاریخ ہے،	غروب ماہ
مہربان علی کی مسجد کی تاریخ ہے،	نظیر کعبہ
فتح کابل کی تاریخ لکھی ہے،	نصر من اللہ فتح قریب
کابل پر حملہ آوروں کو ہزیمت ہوئی تو کہا ہے،	نفس علی المومنین
جہاں آرا بیگم کے لوح مزار کی تاریخ لکھی ہے،	تربت جہاں آرا
بھتیجی کے انتقال کی تاریخ لکھی ہے،	لہا اجر عظیم
تفضل حسین خاں کے باغ کی تاریخ زمین کے تدخلہ سے نکالی ہے۔	حدیقۃ غلبا

اپنی بیٹی فاطمہ سلطان بیگم کی وفات کی تاریخ لکھتے ہوئے صبت فاطمہ کی تلمیح بیان کی ہے اب تو لوگ صبت فاطمہ کو بھول گئے ہیں اس لئے نقل کئے دیتا ہوں سے

صبت علی مصائب لو انہا صبت علی الایام صرن لیالیا

یہ شعر سیدہ خاتون جنت رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ تلمیحات اشارات یہ عربی کی پچی کاری اور گنگا جمنی بغیر عربی فارسی پر عبور حاصل کئے نہیں ہو سکتی،

ایک ترکیب بند جو اپنی محبوبہ کی وفات پر کہا ہے اس کا عنوان رکھا ہے۔

"ترکیب بند بہ مضمون مرثیہ معشوقہ حور ملک شمیم حصلنی وصالہا فی جنت النعیم"

غرض عربی مومن کا اوڑھنا بچھونا تھی ایسے عربی داں کو شرح ملا تک پہونچا کر کریم الدین نے کمال کر دیا ہے، کریم الدین مومن کے معاصر تھے، ملاقاتی تھے، پھر مومن کا ایک دیوان بھی انہوں نے شائع کیا تھا خود عربی داں تھے، ان کا ایسا لکھنا حیرت ناک ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں کریم الدین نے یہ جملہ لکھا ہے، اس کے صرف دو وجوہ ہو سکتے ہیں کہ یا تو کریم الدین نے مومن سے خفا ہو کر ایسا لکھ دیا ہے یا کسی صحبت میں انہوں نے باوجود مومن کی قابلیت دیکھنے کے اپنی عربی دانی کے زعم میں یہ پوچھا ہو کہ آپ کی عربی تعلیم کہاں تک ہوئی ہے اور مومن نے مذاقاً کہدیا ہو شرح ملا تک اور یہ مولوی خش ہی کو لے دوڑے۔

انشائے مومن بھی عربی ترکیبوں، جملوں استعاروں اور تشبیہوں سے بھری ہوئی ہے، بدنصیبی سے اس وقت کتاب میرے سامنے نہیں ہے، اور جو اقتباسات میں نے لئے تھے ان کا بیشتر حصہ دیمک نے ہضم کر لیا ہے جو ٹکڑے بچے ہوئے ملے ان سے کام چلا رہا ہوں جس سے یہ عربی شعر بھی نقل کرتا ہوں جو مومن نے ایک خط میں نقل کیا ہے۔

ولو سلطت تارا التفرق والتوی   علی سقر یوما لذات لہیبہا

کریم الدین کی اس عبارت کے متعلق میں نے نیاز فتحپوری (مدیر نگار لکھنؤ) غلام رسول مہر (لاہور) امتیاز علی عرشی (رامپور) اور پروفیسر ضیاء احمد (علیگڈھ) سے بھی مراسلت کی ہے ان چاروں بزرگوں کا خیال ہی نہیں بلکہ ایقان ہے کہ مومن عربی کے فاضل اور ماہر تھے کریم الدین نے غلط لکھدیا ہے، ان چاروں بزرگوں نے مومن کا مطالعہ کیا ہے اور خوب کیا ہے، اس لئے یہ رائیں وقیع ہیں۔

یہ تو تھی مومن کی عربی دانی کی حد تک تحقیق مگر فارسی تعلیم سے متعلق بھی ہمیں کوئی اطلاع نہ مل سکی کہ کہاں ہوئی اور کس سے ہوئی یا کتنی ہوئی۔ کریم الدین کا یہ لکھنا کہ "فارسی خوب جانتے ہیں" یہ ظاہر نہیں کرتا کہ خوب کی انتہا کیا ہے اگر کریم الدین اس کو بھی ظاہر کر دیتے تو بڑی سہولت ہوتی۔

مومن کا اساتذۂ فارسی کو خاطر میں نہ لانا اور سعدی کی گلستاں تک کو حقارت سے ٹھکرانا ظاہر کرتا ہے کہ وہ زبان فارسی پر غیر معمولی عبور اور قدرت رکھتے تھے، ورنہ کوئی کم علم ایسی جسارت نہیں کر سکتا،

کلب علی خاں فائق نے اپنے مقالے حیات مومن میں سرخوش کے اعجاز سخن کے حوالہ سے لکھا ہے کہ

"فارسی عبداللہ خاں علوی سے جو عدیم المثال عالم تھے تحصیلی تھی،...."

مگر یہ روایت خود فائق ہی کو صحیح نہیں معلوم ہوئی اس لئے خود انہوں نے لکھا ہے،

"لیکن علوی سے مومن نے فارسی پڑھی ہو یہ امر مشتبہ ہے مومن جو سعدی اور حافظ کو خیال میں نہ لاتے تھے وہ علوی کا شاگرد ہونا کس طرح پسند کرتے۔"[1]

مومن عبداللہ خاں علوی کے دوست تھے اور دونوں میں بے تپاک مراسم تھے ان کے شاگرد صہبائی خود مومن کے معتقد اور عقیدت مند تھے چنانچہ تذکرۂ گلستان سخن میں جو صہبائی ہی کا مرتبہ ہے انہوں نے مومن کی انا کی داد یوں دی ہے۔

"سخن سنجان عصر ہر چند بالا دوی فکر سے عرش ناز تھے لیکن چونکہ یہ دالا نگاہ اپنی ہمت عالی کے اوج سے سب کے احوال پر نگاہ کرتا تھا ہر سر بلند اس کو پست اور ہر بزرگ اس کو خرد نظر آتا اور وہ بے تصنع اس کا نام اسی پندار کے

---

[1] اورنٹیل کالج میگزین نومبر ۱۹۵۹ء

موافق زبان پر لاتا..... [1]

اگر مومن عبد اللہ خاں علوی کے شاگرد ہوتے تو صہبائی بڑے فخر سے اس کا اظہار کردیتے،

ذہانت و ذکاوت

آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ

"ان کی تیزی ذہن اور ذکاوتِ طبع کی تعریف نہیں ہو سکتی وہ خود بھی ذہانت میں دو شخصوں کے سوا کسی ہم عصر کو تسلیم نہ کرتے تھے، ایک مولوی اسمٰعیل صاحب دوسرے خواجہ محمد نصیر کہ اُن کے سسر اور خواجہ میر درد کے نواسے تھے، اس سلسلہ میں نواب مصطفیٰ خاں کی ایک وسیع تقریر ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایسا ذکی الطبع آج تک نہیں دیکھا اُن کے ذہن میں بجلی کی سی سرعت تھی وغیرہ وغیرہ [2]

مومن کی ذہانت کے معترف مولوی فضلِ حق خیر آبادی بھی تھے، امیر شاہ خاں کا بیان ہے کہ

مولوی فضلِ حق شطرنج بہت کھیلتے تھے، اور یہ دونوں جب کھیلتے تو مومن خاں بازی لیجاتے تھے، ایک مرتبہ مرزا غالب نے مولوی فضلِ حق سے کہا کہ آپ اس قدر ذہین اور طباع ہیں پھر کیوں مومن خاں سے ہر بار مات کھا جاتے ہیں تو مولوی فضل حق نے کہا کہ مومن خاں ایک بھیڑیا ہے اسے اپنی قوت کی خبر نہیں عشق و عاشقی کے قصوں میں پھنس گیا اگر علمی مشغلہ میں پڑتا تو اس وقت اس کے ذہن کی حقیقت معلوم ہوتی فی الحقیقت نہایت ذہین آدمی ہے" [3]

امیر شاہ خاں نے یہ روایت بھی کی ہے کہ مسئلہ امکان نظیر پر مولوی فضل حق سے بحث ہوئی تو مومن غالب رہے، یہ حکایت دوسری جگہ پوری نقل کی گئی ہے، اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مومن نہ صرف ذہین تھے بلکہ بحث و مباحثہ میں بھی مستعد تھے۔

---

[1] گلستان سخن صـ۲۴۳، [2] آب حیات صـ۴۳۹، [3] امیر الروایات صـ۱۶۰، روایت ۱۵۵

مولوی اسمٰعیل نے اپنی کتاب تقویت الایمان شائع کرنے سے قبل جب علمائے دہلی سے مشورہ کیا تو مولوی عبدالحیٰ، شاہ اسحٰق، مولوی محمد یعقوب، مولوی فریدالدین مراد آبادی اور مولوی عبداللہ خاں علوی کے ساتھ مومن کو بھی بلایا اور مومن ہی کے مشورے پر عمل بھی کیا۔[۱]

وضع ولباس

مومن رنگین مزاج رنگین طبع، خوش وضع، کشیدہ قامت، سبزہ رنگ، سر پر لمبے لمبے گھونگر والے بال اور ہر وقت انگلیوں سے اُن میں کنگھی کرتے رہتے تھے، ململ کا انگرکھا ڈھیلے ڈھیلے پائنچے اس میں لال نیفہ بھی ہوتا تھا۔[۲]

فرحت اللہ بیگ نے مومن کا حلیہ یہ لکھا ہے۔ کشیدہ قامت، سرخ و سفید رنگ جس میں سبزی جھلکتی تھی، بڑی بڑی آنکھیں، لمبی لمبی پلکیں، کھچی ہوئی بھویں، لمبی ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ، ان پر پان کا لاکھا جما ہوا، مسی آلودہ دانت، ہلکی ہلکی داڑھی، بھرے بھرے ڈنڈ، پتلی کمر، چوڑا سینہ، اور لمبی لمبی انگلیاں، سر پر گھنگر والے لمبے لمبے بال کاکلوں کی شکل میں کچھ تو پشت پر اور کچھ کندھوں پر پڑے ہوئے کان کے قریب تھوڑے سے بالوں کو موڑ کر زلفیں بنا لیا تھا۔[۳] جامہ زیبی میں حکیم مومن خاں کے بعد دلی میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ہی کا نمبر تھا۔[۴]

آمدنی

حکیم نامدار خاں کی جاگیر کی ضبطی کے بعد ایک ہزار روپے سالانہ پنشن جو جاری ہوئی تھی وہ ان کے انتقال کے بعد ان کے چاروں بیٹوں پر علی السویہ جاری ہوئی جس کی مقدار فی کس ڈھائی سو روپے سالانہ تھی چونکہ حکیم غلام نبی خاں کو مومن اکلوتے بیٹے تھے اس لئے یہی رقم ان کے حصہ میں بھی آئی۔

۱؎ امیر الروایات ص۸۹ روایت ۴۳/۷، ۲؎ آب حیات ص۴۳۸/۱۲۷، ۳؎ مجلہ اردو اورنگ آباد اکتوبر ۱۹۲۷ء ص۵۹۰، ۴؎ مجلہ اردو اورنگ آباد اکتوبر ۱۹۲۷ء ص۵۹۵،

صاحب آبِ حیات کا بیان ہے کہ ان کے خاندان کے چار طبیبوں کے نام پر سو روپیہ ماہوار پنشن سرکار انگریزی سے بھی ملتی تھی اس میں ایک چوتھائی ان کے والد کو اور ان کے بعد اس میں سے ان کا حصہ ان کو ملتا رہا[1]

اس عبارت سے تو صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مومن کے چاروں بزرگوں (دادا اور چچا) کے نام صرف ایک سو روپے پنشن جاری ہوئی تھی، اس میں سے پچیس روپے حکیم غلام نبی خاں کو ملتے تھے جو ان کے بعد مومن کو ملے، مگر قابلِ غور بات یہ ہے کہ سرکار انگریزی نے چار طبیبوں کے نام سو روپے کس طرح جاری کیے ہوں گے؟ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ حکیم نامدار خاں کے نام سو روپیہ ماہوار پنشن ہو جو ان کے انتقال کے بعد چاروں بیٹوں کے نام علی السویہ تقسیم ہو کر ہر ایک کو پچیس پچیس روپے جاری ہوئے ہوں، ایسی صورت میں مومن کو سالانہ پنشن جاگیر کی ماہوار آمدنی صرف بائیس روپے آٹھ آنے اور سرکار انگریزی کی ماہوار پنشن پچیس روپے جملہ سینتالیس روپے آٹھ آنے ہوتی ہے۔ انشائے مومن سے پتہ چلتا ہے کہ مومن کی زمینداری تھی جس کی آمدنی حکیم احسن اللہ خاں وصول کرتے اور سالانہ مبلغ نو سو اڑتیس روپے مومن کے حصے میں آتے تھے جس کی ماہوار مقدار اٹھتر روپے دو آنے آٹھ پائی تھی، اس طرح مومن کو ۲۲ روپے ۸ آنے + ۲۵ روپے + ۷۸ روپے ۲ آنے ۸ پائی = ما ۱۲۵ روپے ۱۰ آنے ۸ پائی ماہوار آمدنی تھی۔

مگر مومن کے ٹھاٹھ باٹھ رہن سہن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سوا سو روپے ماہوار آمدنی میں اس طرح بسر نہیں کر سکتے تھے، صاحب آبِ حیات نے چاروں طبیبوں کے نام صرف ایک سو روپے ماہوار پنشن بتائی ہے۔ اس میں انھیں تسامح ہوا ہے، مومن کے خاندان کے چاروں طبیبوں کے نام سو سو روپے پنشن ہوگی اور مومن کو پورے سو روپے حکیم غلام نبی خاں کے بعد ملے ہوں گے۔ اس طرح موادِ حصہ جاگیر کے ماہوار بائیس روپے آٹھ آنے اور زمینداری کے ماہوار اٹھتر روپے دو آنے آٹھ پائی اور ماہوار پنشن کے

---

[1] آبِ حیات ص ۴۳۹۔

ایک سو روپے جملہ دو سو روپے دس آنے آٹھ پائی مومن کو ملتے ہوں گے جس کی وجہ سے وہ نہ تو مطب سے کوئی فائدہ حاصل کرتے تھے نہ نجوم رمل وغیرہ سے اور پھر خوش حالی اور فارغ البالی کے ساتھ امیرانہ ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرتے رہے۔

مومن کی بیوی کو جہیز میں ایک مکان بھی ملا تھا جو کرایہ پر اٹھا دیا گیا تھا اس کا کرایہ بھی انھیں ملتا ہوگا۔ مگر بعد کو یہ مکان مومن نے بیچ ڈالا تھا، بہرحال یہ بھی ان کی آمدنی میں کرایہ کا اضافہ کرتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ اُن کی ذاتی جائداد اور بھی تھی۔

نواب تفضل حسین خاں اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور نواب حامد علی خاں، جیسے متمول رئیس مومن کے مخلص دوست اور شاگرد تھے، یقیناً یہ لوگ حسب حیثیت کچھ نہ کچھ سلوک کرتے ہی ہوں گے، چنانچہ نواب تفضل حسین خاں نے مومن کے بیٹے احمد نصیر خاں کو گود لیا تھا، اور اس کے مصارف کے کفیل رہی تھے، یہ بات انشائے مومن کے مطالعہ سے ظاہر ہوتی ہے، مومن کے چہیتے بھائی اور مخلص دوست حکیم احسن اللہ خاں تھے، جو مومن کے انتقال تک نہایت ہی مرفہ الحال اور صاحب اقتدار تھے ان کا سلوک بھی ہوگا۔

غرض مومن نہایت ہی بے فکری کی زندگی بڑے ہی طمطراق سے بسر کرتے رہے۔

تفریحی مشغلے

درسِ محبت تو مومن کو بچپن ہی میں مل گیا تھا اور شاعری بھی انہوں نے بچپن ہی میں شروع کی تھی، طب کے ساتھ انہوں نے نجوم اور رمل بھی سیکھنا شروع کر دیا تھا، اور شاید موسیقی سے بھی شوق ہو گیا تھا، اس لئے اپنا وقت ان ہی مشغلوں میں صرف کرنے لگے، دوست احباب کی تعداد بھی خاصی تھی اور مختلف رنگ کے دوست الگ الگ تھے۔

حکیم سکھانند جی کو نجوم اور رمل سکھلاتے اور اُن سے شطرنج کھیلتے تھے، کرامت علی خاں شاطر، فضل حق، اور شہزادہ رحیم الدین حیا یہ چاروں شطرنج ہی کے شائق تھے اِن سے شطرنج کھیلی جاتی تھی، مصطفیٰ خاں شیفتہ غلام علی وحشت، اور غلام ضامن کرم یارانِ غار تھے اُن کے ساتھ

پورے لہو و لعب میں شریک رہتے تھے، شیفتہ اور وحشت کو لال پری (بنت العنب) کا شوق بھی تھا، ممکن ہے مومن بھی ہم رنگ ہوں، مگر ہمیں کوئی ثبوت نہ مل سکا البتہ شیفتہ کی بادہ خواری ثابت ہے کیونکہ انہوں نے حج بیت اللہ کے بعد سے توبہ کرلی تھی، اور بقول خود ترکِ صہبا کردیا تھا۔[۵]

اے شیفتہ جب کہ ہم آئے ہیں حرم سے ۔۔۔ شوقِ صنم و خواہش صہبا نہیں رکھتے

مفتی صدرالدین خاں سے بھی دلی لگاؤ تھا، اور روزانہ ان کی صحبت میں شاعری تھی اور مولوی اسمٰعیل سے بھی بڑی گاڑھی چھنتی تھی، اس طرح مومن ہر رنگ میں رنگے ہوئے تھے، مولوی اسمٰعیل انھیں مولوی سمجھتے تو مفتی صدرالدین پاکباز جانتے اور وحشت و شیفتہ رند عاشق مزاج پاتے تھے۔

مومن صبح و شام مطب کرتے دن بھر نجوم اور رمل دیکھتے سائلین کے جواب دیتے دوستوں سے شطرنج کھیلتے اور شاعری کرتے، یہ سب مشاغل تفریحی تھے، جس طرح وہ بغیر کسی معاوضہ کے مریضوں کا علاج کرتے اور بغیر کسی معاوضے کے نجوم اور رمل کے زائچے بنادیتے اسی طرح بغیر کسی معاوضے کی خواہش اور صلے کی طلب کے شعر بھی کہتے رہتے۔

دلی میں ان دنوں تین ہی استاد تھے، مومن، غالب اور ذوق، مومن ہی ایک غیر پیشہ ور شاعر تھے ورنہ غالب اور ذوق دونوں پیشہ ور تھے اور دونوں کی وجہ معاش شاعری ہی تھی، ذوق کے متعلق تو کسی جاگیر منصب یا پنشن کا کوئی واقعہ تھا ہی نہیں قلعہ کی آمدنی پر گزران تھی مگر غالب نے باوجود جاگیر پنشن کے شاعری کو وجہ معاش اور قصیدہ گوئی کو پیشہ بنالیا تھا، غالب کا ایک خط منشی نبی بخش کے نام خواجہ حالی نے نقل کیا ہے کہ "بھائی! تم غزل کی تعریف کرتے ہو اور میں شرماتا ہوں، یہ غزلیں کاہے کو ہیں پیٹ پالنے کی باتیں ہیں میرے فارسی کے وہ قصیدے جن پر مجھ کو ناز ہے کوئی ان کا لطف نہیں اٹھاتا"[۱]

مومن نے کبھی کوئی معاوضہ شاعری کا مانگا نہ کسی نے دیا اور نہ انھیں اس کی ضرورت

---

[۱] یادگار غالب ص ۱۴۰،

ہی تھی، بقول آزاد شاعری دل کا بہلاوا تھی، اور کچھ نہیں، اب ان تفریحی مشاغل کا حال الگ الگ سنیئے۔

طبابت

مومن خاندانی طبیب تھے، ان کے والد حکیم غلام نبی خاں، بڑے ماہر طبیب تھے، اور چچا غلام حیدر خاں اور غلام حسن خاں بھی اپنے وقت کے بڑے نام آور طبیب تھے، حکیم غلام حسین خاں کی حذاقت دکن میں مسلم تھی ایسے چچاؤں کا بھتیجا ظاہر ہے کہ انھیں کے جیسا ہوگا، چنانچہ مومن خاں بھی ویسے ہی بن گئے، اور طب میں انھوں نے غیر معمولی ملکہ حاصل کرلیا کیونکہ تعلیم مکمل ہوئی تھی، بڑے جید اطبا کے مطب میں نسخہ نویسی کی تھی اور پھر قدرت نے غیر معمولی ذہن سرفراز کیا تھا، اِن سب خوبیوں نے اُن کو کامل بنا دیا تھا، تمام تذکرہ نویسوں نے مومن کے بہترین طبیب ہونے کا اعتراف کیا ہے، چنانچہ سب سے زیادہ حسرت، کریم الدین ہیں

اِن ساری خصوصیات کے باوجود انھیں طبابت بہ پیشگی ناپسند تھی، چنانچہ انشائے مومن میں ایک ایسا خط ہے جس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ طبابت پیشہ شاگردوں کے ہجوم سے تنگ اور مریضوں کی آمد سے ناخوش رہتے تھے، یہی وجہ تھی جو انھوں نے مستقل مطب نہیں کیا بلکہ مطب میں شطرنج بازی کرتے رہے، مگر دوست احباب اور عزیز و اقارب کا علاج وہ کرتے رہتے تھے، چنانچہ ان کے دیوان میں اپنے دوستوں کی صحت یابی کی تاریخیں بھی نظر آتی ہیں جو ظاہر ہے کہ انھیں کے علاج سے صحت مند ہوئے ہوں گے۔

مگر باوجود اس فن سے بیزار ہونے کے وہ اس سے چپٹے رہے اور مرنے تک علاج معالجے کرتے ہی رہے۔

شطرنج

آزاد کا بیان ہے "شطرنج سے ان کو کمال مناسبت تھی، جب کھیلنے بیٹھتے تو دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہتی اور گھر کے نہایت ضروری کام بھی بھول جاتے تھے، دلی کے مشہور شاطر

کرامت علی خاں سے قرابت قریبہ رکھتے تھے ۔ اور شہر کے دو ایک شاطروں کے سوا کسی سے کم نہ تھے[۵۱]

کرامت علی خاں شاطر کی والدہ عائشہ بیگم مومن کی حقیقی پھپی تھیں جو مرزا قاسم بیگ غزنوی سے بیاہی گئی تھیں، جن سے ایک لڑکی صاحب بیگم اور دو لڑکے کرامت علی خاں اور برکت علی خاں تھے، صاحب بیگم کے بطن سے مرزا عبداللہ بیگ تھے، جو مرزا فرحت اللہ بیگ کے دادا تھے، کرامت علی کے خاندان سے دلی کے مشہور قنوطی ادیب راشد الخیری تھے جن کی اولاد اب پاکستان میں موجود ہے،

کرامت علی خاں سے مومن کو بڑی محبت تھی، چنانچہ روزانہ دونوں ملتے جلتے رہے اور شطرنج بازی ہوتی تھی۔ ۱۲۵۹ھ میں کرامت علی خاں نے انتقال کیا تو مومن نے بڑی عمدہ تاریخ کہی ہے

منصوبۂ مرگ بیں کہ بے مات	نگذاشتہ ہیچ آدمی را
زین خانہ بخانۂ عدم برد	یک کشت کرامت علی را
افسوس کہ طرفہ شہری خورد	نادیدہ مرائے مدعی را
تا فکر شمار سال تاریخ	زچ کرد رقوم ہندسی را
گفتیم کرامت علی خاں	تہ کرد بساط زندگی را

۱۲۵۹ھ

(کرامت علی خاں میں سے بساط زندگی کا تخرجہ ہے)

حکیم سکھانند رقم روزمرہ کے حاضر باش اور نجوم و رمل میں مومن کے شاگرد تھے جو شطرنج کے دلدادہ تھے وہ بھی دن بھر بیٹھے شطرنج کھیلا کرتے تھے، مولوی فضل حق مومن کے

---

[۵۱] آب حیات ص ۴۳۷

بے تکلف اور مخلص دوست تھے، باوجود اختلاف عقائد کے دونوں میں بڑی محبت تھی، مومن غیر مقلد اور فضل حق غالی مقلد تھے اور دونوں ایک دوسرے کو بدعتی بھی کہتے تھے۔ مگر دوستی میں کوئی فرق نہ آیا تھا فضل حق باوجود اپنی ذہانت اور فطانت کے ہمیشہ مومن سے مات کھاتے مگر روز شطرنج کھیلنے آتے تھے اور مومن کی ذہانت کے بے انتہا قائل تھے، شہزادہ مرزا رحیم الدین حیا بھی مومن کے دیوان خانے کے حاضر باشوں میں سے تھے شطرنج کھیلتے اور ولایت سے جو نقشے آتے تھے انھیں حل کرانے کے لئے مومن کے پاس لاتے تھے غرض شطرنج کی صحبت مستقل تھی اور دن بھر بساط بچھی ہی رہتی تھی۔

نجوم اور رمل

مومن کو نجوم اور رمل سے بڑی دلچسپی تھی، یہ علم بھی انہوں نے عنفوان شباب ہی میں سیکھا تھا، چنانچہ اپنی پہلی مثنوی میں مومن نے نجوم کی اصطلاحات نظم کئے ہیں جو سترہ برس کی عمر میں نظم ہوئی ہے، آزاد کا بیان ہے کہ اس فن کو مومن نے اہل کمال سے سیکھ کر بڑی مہارت بہم پہنچائی تھی اور ان کے احکام سن کر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے۔[1]

نجوم چونکہ حسابی علم ہے اس لئے مومن نے ریاضیات میں بھی مہارت پیدا کرلی تھی جس کی وجہ سے ان کو تاریخ گوئی میں بڑی سہولت ہوگئی تھی، ہندستان کے مسلمان عام طور پر حساب سے دلچسپی نہیں رکھتے تھے اور شعراء تو حساب سے دور ہی بھاگتے رہے چنانچہ غالب سے متعلق کسی نے شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ سے پوچھا کہ "مرزا صاحب کو بھی ریاضی میں کچھ دخل تھا" تو انہوں نے جواب دیا "ایسا ہی دخل تھا جیسے مجھے شاعری میں ہے۔"[2] برخلاف اور شعراء کے مومن کو نہ صرف ریاضی سے دلچسپی تھی بلکہ اس پر ماہرانہ عبور بھی تھا، اس کی وجہ سے وہ نجوم اور رمل میں کمال پیدا کرکے اپنے وقت کے واحد نجومی بن گئے

---

[1] آب حیات ص ۴۳۶، [2] یادگار غالب ص ۵۹،

تھے، ان کی زندگی میں مسلمانوں میں تو کیا ہندوؤں میں بھی کوئی نجومی ان کی ٹکر کا نہ تھا، اور سوا مومن کے اور کوئی شخص دلی میں تقویم مرتب کرتا تھا، یہی وجہ تھی جو مومن کے متعلق مشہور تھا کہ وہ سال میں ایک مرتبہ تقویم دیکھ لیتے تھے اور پھر گھڑی گھڑی تقویم نہ دیکھتے تھے چونکہ وہ خود تقویم مرتب کرتے تھے اس لئے ستاروں کی رفتار ان کے دماغ میں محفوظ رہتی تھی اور وہ بے تکلف ہر جگہ بیٹھ کر زائچہ بنا لیتے تھے،

پنج آہنگ[1] کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن اپنی مرتبہ تقویم غالب کو بھجوایا کرتے تھے، اور انشائے مومن میں مومن نے اپنی مرتبہ تقویم کے سنہ ۱۲۴۸ھ، سنہ ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۳ء، سنہ ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴ء اور سنہ ۱۲۵۲ھ[2] کے دیباچوں کی نقلیں بھی شریک کر دیئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مومن مسلسل تقویم مرتب کرتے رہے ہیں۔

علم نجوم دو حصوں پر منقسم ہے علم الاخبار اور علم الآثار، علم الاخبار تو وہ ہے جس سے پیشین گوئیاں کی جاتی ہیں، احکام دیئے جاتے ہیں، بری بھلی خبریں بتائی جاتی ہیں، علم الآثار یہ ہے جس کا نام نیرنجات، رقی اور عملیات رکھا گیا ہے۔ علم الاعداد بھی اس کی شاخ ہے اور علم الحروف بھی، یہ ایک مستقل شعبہ ہے، بزرگانِ دین عام طور پر اس فن سے واقف ہوتے تھے، مگر اپنے زہد و تقویٰ کی وجہ سے علم الاخبار کی طرف توجہ نہ کرتے تھے بلکہ علم الآثار پر نظر رکھتے تھے اسی لئے اس فن کو عوام نے انھیں بزرگوں کا مخصوص علم سمجھ لیا ہے دراصل یہ علم نجوم ہی کا ایک شعبہ ہے، مومن کے قصائد سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں علم الآثار میں کمال تھا،

مومن کے گلے میں جو تعویذ پڑی رہتی تھی وہ بھی اسی علم کا ثمرہ تھی، مومن کی تعویذ نویسی اور نقش نگاری کے قصے بھی مشہور رہیں، غرض مومن نہ صرف علم الاخبار ہی کے ماہر تھے بلکہ علم الآثار پر بھی انھیں پورا پورا عبور تھا، غالباً یہ علم بھی انھیں "مہرخوں" سے تقرب حاصل کرنے میں

---

[1] پنج آہنگ ص ۱۲۵، ۱۲۶، [2] انشائے مومن ص ۲۰۹، ۲۱۶، ۲۲۴، ۲۵۶

ان کی مدد کرتا رہا ہے۔

مومن کی اس خصوصیت کے بارے میں عبدالکریم نے بہت سی باتیں لکھ کر آزاد کو بھیجی تھیں مگر انہوں نے اعتنا نہیں کی صرف ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک دن کوئی غریب ہندو نہایت ہی بیقرار و پریشان آیا اور اس نے خان صاحب سے کہا کہ میں لٹ گیا۔ اسکا منہ دیکھنے لگے اور فرمایا بس خاموش رہو کیا تمہارا مال جاتا رہا ہے؟ وہ گھبرا کر بوکھلاہٹ میں چھاتی پیٹ کر اٹھا حضرت کیا کہوں لٹ گیا مومن نے کہا میں جو کہوں اسے سنو جو غلط ہو اس سے انکار کر دینا پھر پوچھا کہ زیور کس قسم کا تھا؟ اس نے کہا ہاں صاحب! عمر بھر کی کمائی تھی یہ سن کر کہا تم نے لیا ہے یا تمہاری بیوی نے کوئی غیر چرانے نہیں آیا اس نے کہا مال میرا تھا اور بیوی کے پہنے کا زیور تھا ہم خود کیوں چراتے یا وہ کیوں چھپاتی؟ مومن نے کہا کہیں رکھ کر بھول گئے ہیں مال باہر نہیں گیا اس نے کہا صاحب! سارا گھر ڈھونڈھ ڈالا کوئی جگہ باقی نہیں مومن نے کہا جاؤ اور پھر دیکھو وہ گیا اور پھر سارے گھر کو اچھی طرح دیکھ آیا کہنے لگا گھر کا کونا کونا دیکھ لیا ہے کہیں پتہ نہیں ہے مومن اس وقت شطرنج کھیل رہے تھے اس کی طرف دیکھ کر کہا تم غلط کہہ رہے ہو اس نے کہا آپ خود چل کر دیکھ لیجئے یہ سن کر مومن نے اس کے گھر کا پورا نقشہ بیان کر دیا اور کہا کہ جنوب رخ جو کوٹھری ہے اس میں شمال رخ جو لکڑی کا مچان ہے اس پر تمہارا مال موجود ہے اس نے کہا صاحب! میں نے تین بار اس مچان کو دیکھا ہے کہا اسی کے ایک کونے میں مال پڑا ہوا ہے غرض وہ گیا اور مومن کی نشاندہی کے بموجب دیکھا تو مال پڑا پایا۔ اس نے خوش خوش واپس آکر اعتراف کیا کہ آپ نے صحیح کہا تھا مال وہیں پڑا ہوا ملا۔[1]

حکیم سکھانند رقم دلی کے قدیم لوگوں میں سے تھے شاعری میں شاہ نصیر کے اور

---

[1] آب حیات ص ۴۳۶، ۴۳۷

نجوم و رمل میں مومن کے شاگرد تھے، نہایت خوش وضع، خوش اخلاق، خوبصورت، ظریف اور متین بزرگ تھے چونکہ فارغ البال تھے، اس لئے مومن کے دربار میں ہمیشہ حاضر رہتے تھے، ایک دفعہ وہ بیٹھے ہوئے شطرنج کھیل رہے تھے کہ ایک چھپکلی دیوار پر نظر آئی، مومن نے شطرنج کھیلتے کھیلتے چھپکلی کو دیکھا تو رقم سے کہا، حکیم جی! ذرا دیکھنا یہ چھپکلی دیوار سے کب ہٹے گی؟ حکیم جی نے اسی وقت زائچہ بنایا اور حکم لگایا کہ حضور! یہ ابھی چلی جاتی ہے، مومن نے کہا، واہ جب تک پورب سے اس کا جوڑا نہ آجائے کیونکر جائے گی، پھر دیکھو، حکیم جی نے پھر حساب جانچا مگر ان کی سمجھ میں نہیں آیا، یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک ریشمی کپڑوں کا تاجر دو گٹھے (گانٹھ) مزدور کے سر پر رکھے ہوئے لایا اور جوں ہی مزدور نے گٹھا سر سے نیچے پٹکا، ٹپ سے ایک چھپکلی اس میں سے گری اور دوڑ کر دیوار پر چلی گئی۔ اور دیوار والی چھپکلی سے جا ملی، پھر دونوں چھپکلیاں ایک طرف کو چلی گئیں۔[1]

نثار علی شہرت دہلوی کا بیان ہے کہ "مومن رمال اور جوتشی اتنے بڑے تھے کہ آپکے زمانے میں آپ کا ثانی نہ تھا، ایک بار کا ذکر ہے کہ ہمارے بھائی منشی صمد علی حسرت بر ایام طفولیت گھر سے جو نکلے تو منہ اُٹھا کر خاص بازار ہوتے ہوئے چاوڑی اور بنیا بانس سے بھی آگے نکل گئے، غرض کھو گئے، تلاش ہونے لگی، والد ماجد مومن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی صمد علی کھو گیا ہے۔ رمل سے دریافت کیجئے" آپ نے پانسہ پھینکا اور کئی بار پانسے پھینک کر حساب لگایا تو فرمایا کہ صمد علی ایک شخص کے کندھے پر سوار ہے اور اپنے گھر پہونچنے والا ہے، والد ماجد گھر کی طرف دوڑے تو اپنے محلے کے قریب ہی کیا دیکھتے ہیں کہ صمد علی اپنے ماموں کے کندھے پر بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ گھر کی طرف لے جا رہے ہیں"[2]

---

[1] مجلہ اردو اورنگ آباد اکتوبر ۱۹۲۷ء صہ ۵۹۱، ۵۹۳، [2] ماہنامہ مخزن مارچ ۱۹۱۵ء صہ ۶۵،

راجگان ہند کو نجوم کا ذوق رہا ہے چنانچہ ہر ریاست میں دو ایک نجم ضرور ملازم ہوتے تھے اور مشہور منجمین بھی ان ریاستوں میں آتے جاتے رہتے تھے اور راجگان ان سے جنم پترے ماس پھل اور برس پھل نکلواتے تھے، مہاراجہ پٹیالہ کی کوٹھی دلی میں ہی تھی جس میں آپ کے چھوٹے بھائی رہتے تھے جن کا نام اجیت سنگھ تھا، ایک روز وہ بالاخانے پر بیٹھے سڑک کی سیر کر رہے تھے کہ مومن راستے سے گذرے ان کی وضع قطع اور جامہ زیبی دیکھ کر راجہ صاحب نے مصاحبین سے پوچھا کہ یہ کون ہیں تو عرض کیا گیا دلی کے مشہور شاعر اور نجم مومن خاں ہیں راجہ صاحب نے اپنے ایک مصاحب کو بھجوا کر انھیں بلایا، اور بڑے اعزاز سے بٹھا کر بات چیت کی، شعر سنے نجوم اور رمل بھی پوچھا"

ظہیر دہلوی بیان کرتے تھے کہ انہوں نے دہلی کے بزرگوں سے سنا ہے کہ راجہ نے مومن سے بعض سوال بڑے ٹیڑھے کیے تھے جن کے جواب مومن نے بلا تامل دیئے اور ضمیر کے سوالات کے جواب بھی ایسے دیئے کہ راجہ حیران ہو گئے" نجوم اور رمل کے امتحان کے بعد راجہ نے اپنا ہاتھ بتایا تو مومن نے ہاتھ دیکھ کر سمدرگ (پامسٹری) کے بعض حقائق بھی سمجھائے اس ہمہ گیری کو دیکھ کر راجہ بے انتہا متحیر ہوئے اور انہوں نے مومن کو ہتنی پر بٹھا کر رخصت کیا۔

مومن نے آخری پیشین گوئی اپنے کوٹھے سے گرنے کے بعد کی تھی کہ پانچ روز یا پانچ مہینے یا پانچ سال کے بعد مریں گے، ظاہر ہے کہ یہ پیشین گوئی مومن نے کوٹھے گرنے کے پہلے دوسرے ہی روز کی ہوگی، مومن کا ہاتھ اور مونڈھا ٹوٹ گیا تھا، اس تکلیف میں بھی انہوں نے یہ ادنیٰ تامل بلکہ بلا تامل یہ پیشین گوئی کی تھی اگر تکلیف کی شدت کم ہونے کے بعد وہ غور کرتے تو یقیناً صحیح وقت بتا سکتے تھے مگر انہوں نے اس کی کوشش نہیں کی اور حکیم احسن اللہ خاں اور عبد الرحمٰن آہی نے انھیں فارسی اردو دیوان کی نظر ثانی میں مصروف کر دیا، اور پانچ مہینے کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

موسیقی

مومن کی موسیقی دانی کی بھی شہرت ہے مگر ہمیں کوئی ثبوت ملا اور نہ کوئی روایت ہی نظر سے گذری' مگر قوی احتمال ہے کہ وہ موسیقی سے واقف تھے کیونکہ اپنے کلام (خصوصاً مثنویوں میں) انہوں نے جگہ جگہ موسیقی کے اشارات کئے ہیں اور ان کی مترنم بحریں ان کی موسیقی دانی کی گواہ ہیں'

عرش گیاوی نے حیات مومن میں مومن کو سادہ کار' آتش باز اور صنعت دحرفت کا ماہر بتا دیا ہے اور مومن کی سادہ کاری وغیرہ کے نمونے ان کے خاندان میں محفوظ ہونا بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا بھی ظاہر کیا ہے' ان بیچاروں کی نیکی اور سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر مومن کے خاندان والوں نے انھیں بجھا دیا ہے' مومن کے خاندان والوں کی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ انھیں یہ تک معلوم نہیں کہ حکیم نامدار خاں شیخ تھے یا سید' مغل تھے یا پٹھان وہ اتنا بھی نہیں جانتے تھے کہ حکیم نامدار خاں کے باپ کا کیا نام تھا ؟ مومن کے خاندان میں مومن کا کوئی دیوان محفوظ رہا اور نہ ان کی کسی تحریر کا کوئی پرزہ' ناصر خبیب نے عرش کو یہ باور کرا دیا کہ مومن سید تھے اور حکیم اجمل خاں مرحوم حکیم کامدار خاں کی اولاد سے تھے' حالانکہ یہ دونوں باتیں بالکل غلط تھیں۔

غرض مومن کے تفریحی مشاغل اتنے ہی معلوم ہو سکے جتنے بیان کئے گئے ہیں' البتہ ان کی سب سے بڑی تفریح عاشقی تھی' جس کا ذکر آگے کروں گا' فی الحال ان کی شاعری سے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں'

شاعری

مومن کی شاعری سے متعلق کچھ پتہ نہیں چلتا کہ انہوں نے کب سے شروع کی اور کیوں شروع کی' حالی نے مومن کے جو حالات مرتب کر کے آزاد کو آب حیات کے لئے بھجوائے تھے جنھیں آزاد نے طبع دوم میں شریک کر لیا ہے' ان سے بھی کوئی ایسی بات معلوم نہیں ہوتی' نہ ہی

شیفتہ نے گلشن بے خار میں کچھ لکھا ہے، یوں تو مومن کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں مگر کام کی بات ایک نہیں لکھی ہے۔ اس لئے مومن کی شاعری کا آغاز، شاعری کی ابتدا، شعر گوئی کی تشویق کے وجوہ اور اسی قبیل کی باتیں معلوم ہی نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مومن کس طرح شاعر بنے، کب سے انہوں نے شاعری شروع کی اور کیونکر شروع کی اور ان کی شاعری کی ابتدا کس قسم کی تھی اور بعد میں کیا ترقی ہوئی؟

مومن کی ولادت حکیموں کے گھرانے میں ہوئی باپ دادا حکیم تھے چچا اور بھائی وغیرہ بھی حکیم ہی تھے، چو طرف نبض، قارورہ، قرابادین اور تشخیص تھی کوئی شخص اس گھرانے میں شاعر نہ تھا اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے غیر شاعرانہ ماحول میں مومن جیسے بڑے شاعر کیوں بن گئے؟

مومن پڑھتے تھے شاہ عبدالقادر کے مدرسے میں اور ساتھ تھا مذہبی قسم کے طلبا کا پھر وعظ سنتے تھے شاہ عبدالعزیز کا جسے اپنے حافظے میں محفوظ بھی کر لیتے تھے اور پھر دہرا بھی دیتے اور قرآنِ مجید بھی حفظ کرتے رہتے، ہوش سنبھالا تو شاہ اسمٰعیل کا ساتھ ہوا جو کٹر مذہبی آدمی تھے، گھر پر طبی تعلیم اور مطب میں نسخہ نویسی، ہر طرف غیر شاعرانہ ماحول، مگر باوجود اس کے مومن شاعر بن گئے۔

ان حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ماحول یا صحبت نے انھیں شاعر نہیں بنایا بلکہ قدرت ہی انھیں بنانا چاہتی تھی اور وہ پیدائشی شاعر تھے اس لئے وہ شاعری کرنے پر مجبور تھے، ان کی یہ شاعری اکتسابی نہ تھی بلکہ وہبی تھی۔

یہ ماننے کے بعد کہ وہ وہبی شاعر تھے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انہوں نے بچپن ہی سے شاعری شروع کی ہوگی کیونکہ جو شخص آٹھ نو سال کی عمر میں عاشقی کر سکتا ہے وہ شاعری بھی کر سکتا ہے۔

اپنی پہلی مثنوی شکایت ستم میں انہوں نے کہا ہے ؎

یعنے طفلی سے ہوں میں پیرِ مُغاں | بلد براہ گرہاں جہاں
تھے برس ہم شمارہ افلاک | کہ ہوا پایا تمال صورتِ خاک

اور اس زمانے میں شغلہ یہ تھا ۔

حفظ قرآں و یاد مصحف رو | فرصت اکم نہ روز و شب میں کبھو
دن کو وردِ زباں سبق ناچار | رات کو درس شوق کی تکرار

اسی شغلے میں مومن نے دو سال بسر کیے ۔

آفت جان و دل فراق و وصال | الغرض یوں ہی کٹ گئے دو سال

دو سال کے بعد پہلی محبوبہ نے اپنی موت سے مومن کو فراق دائمی میں مبتلا کر دیا تو مومن آتش فراق میں جلنے لگے یہ پہلی چوٹ تھی جو مومن کے دل پر لگی اور اسی نے انھیں شاعر بنا دیا

دو ایک سال اسی طرح گزر گئے پھر ایک زہرہ جبیں نے دل پر قبضہ کر لیا ۔

سال عمر اب تھے ہم شمار بروج | کہ ہوا اختر بلا کا عروج

اس طرح بارہ سال کی عمر میں دوسری عاشقی شروع کی اور سال بھر تک دادِ عیش و عشرت دیتے رہے ۔

اک برس تک یہی رہا عالم | زندگی کے مزے اُٹھائے بہم

مگر اس کے بعد پھر فراق میں مبتلا ہونا پڑا اور ۔

الغرض یوں ہی کٹ گئے دو سال

اور اس دو سال کے بعد پھر ملاقات ہوگئی اور وہی عیش و عشرت کا زمانہ آگیا اور مومن وصال محبوبہ اور شغل شاعری میں منہمک ہوگئے چنانچہ ایک روز محبوبہ کی ماما بلانے آئی تو اپنے دیوان خانے کا دروازہ بند کیے مومن شعر کہہ رہے تھے ۔

بند دروازہ واں کا تھا ناگاہ | در کشائے سخن دل آگاہ
شوق کی مشق نالۂ موزوں | باندھتا تھا میں دل کشا مضموں

آکے بولی کہ ہے کوئی تو بول — آج کیا بند و بست ہے در کھول
میں نے بیتاب ہو، کہا کیا ہے — لگی کہنے تمہیں بلایا ہے
کہا میں نے کہ رہ کے آؤں گا — ایک دو شعر کہہ کے آؤں گا

اس طرح مومن شعر کہتے رہے، گویا آٹھویں سال کے بعد ہی مومن نے عاشقی اور شاعری ایک ساتھ شروع کی اور یہ سلسلہ سترہ سالہ عمر تک جاری رہا ہے

دیکھیں آگے دکھائے کیا کیا دن — ہے ابھی سترہ برس کا سن

چنانچہ یہ مثنوی مومن نے ۱۲۳۱ھ میں ختم کر کے اس کا تاریخی نام شکایتِ ستم رکھا ہے، اس وقت مومن نے اپنی زندگی کے سولہا سال ختم کر کے سترہ سال میں قدم رکھا تھا، اس مثنوی کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ کوئی عربی کا طالب علم طب کا ماہر اور نجوم کا بتدی عربی آمیز اور دفاری خیز زبان میں مشق شعر کر رہا ہے۔ یہ مثنوی اس طرح شروع ہوتی ہے

ساقیا دے چک آبِ آتش رنگ — گرم و سرد زمانہ سے ہوں تنگ
نالۂ آتشیں تف پر درد — کرۂ زمہریر ہے دم سرد
جوشِ ضعف و تنا سے حال نہیں — اس ہوا میں کہ اعتدال نہیں
مئی طبیب رواں محزوں ہے — خم بادہ خم فلاطوں ہے
یہ اگر التفات فرما ہو — باد صرصر دم مسیحا ہو
گرم تدبیر گر ذری ہو جائے — تپ غم نارِ عنصری ہو جائے
چارہ سازی کرے جو بعد ہلاک — بیضۂ خاک شفا مزار کی خاک
گرعرق ریز فکر درماں ہو — گریۂ ماتم آبِ حیواں ہو
اس سے ممکن علاج عاشق ہے — گرم و تر ہم مزاج عاشق ہے
کہو وے یہ رشک شربت اعجاز — نزلۂ اشک چشم اہلِ نیاز
کیا کہوں اس کی چارہ فرمائی — ہے یہ تریاق زہر تنہائی

میں بھی محتاج چارہ سازی ہوں — خستۂ زخم بے نیازی ہوں

اسی زمانے میں مومن نے شاید نجوم بھی پڑھنا شروع کیا تھا کیونکہ محاورات و اصطلاحات نجوم اس مثنوی میں ہیں۔

کیا پامال سیر اختر نے — پاؤں پھیلائے نحس اکبر نے
راہ پر تیسری آسماں نہ رہا — زہرہ برجیس کا قراں نہ رہا
سیر اختر سے ہوں میں سرگشتہ — نہ پھرے ہائے بخت برگشتہ
ہو گئی رجعت آہ گردوں کو — عکس تھا مجھ سے بخت واروں کو
ماہ نے خاک پر لٹایا ہے — گردش مہر نے جلایا ہے
کیا فروغ آتش فراق میں ہے — مشتری زہرہ احتراق میں ہے
جان پامال راس سے جوں خاک — سیر مریخ نے کیا ہے ہلاک
ہے عطارد کو ان دنوں میں وبال — خط تقدیر مٹ سکے یہ محال
ہندوئے چرخ نے تباہ کیا — روز روشن مرا سیاہ کیا

غرض اس مثنوی سے عربی فارسی کی طالب علمی، طبی مہارت اور نجوم کی قابلیت ظاہر ہو رہی ہے مگر آخری حصہ گواہ ہے کہ یہ شاعر و عاشق الھڑ اور ناآزمودہ کار ہے ۔

اسکو پروا نہیں کہ مرتا ہوں — چندے اور انتظار کرتا ہوں
بن ملے انتقام لوں گا میں — سچ کسی اور سے ملوں گا میں
لطف پیر فلک نے کیوں نہ کئے — عمر کیا تھی جو ایسے داغ دیے
کیسی کیسی سیہ شبیں آئیں — ایسی ایسی بلائیں دکھلائیں
دیکھیں آگے دکھائے کیا کیا دن — ہے ابھی سترہ برس کا سن
مومن آ تو بھی اپنے نام پہ جا — نام پر ان بتوں کے آگ لگا

اس آخری شعر یا مقطع سے صاف ظاہر ہے کہ مومن نے ناسخ کی تتبع شروع کر دی تھی اور

اپنے نام ہی کو تخلص بنا لیا تھا اور بت و کفر کا تلازمہ بھی استعمال کرنے لگے تھے، یہ پہلی مثنوی جو سترہ برس کے نوجوان شاعر کی فکرِ جمیل کا نتیجہ ہے، اس شاعر کے مستقبل کی جھلکیاں دکھا رہی ہے

مثنویِ اول کے چار سال بعد ۱۲۳۵ھ میں دوسری مثنوی "قصہ غم" عالم وجود میں آتی ہے، اب مومن کا شوق بڑھ گیا تھا، پہلی مثنوی کہے ہوئے چار سال اور مشقِ سخن کرتے ہوئے چھ سات سال ہو چکے تھے، اس مثنوی سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر کوئی طالب علم یا مبتدی نہیں ہے بلکہ ایک نوخیز شاعر اور فنِ شعر کا ماہر ہے، ابتدا یوں کی ہے ؎

کچھ دارو مریز کب تلک یوں — بس جام میں بھر شراب گلگوں
پھر لب سے مرے اسے لگا دے — ساغر کوئی متصل پلا دے
ساقی ہیں یہ روز ہائے گلگشت — ہے غیرت باغ ہر بر و دشت
اب دورِ فلک سے دل ہوا شاد — ہے نام حمل کا گھر آباد

معلوم ہوتا ہے کہ اس مثنوی کی تصنیف کے زمانے میں مومن کی مشق نجوم زوروں پہ تھی کیونکہ نجوم کے اصطلاحات بہت نظم ہوئے ہیں، مگر اب مومن سترہ سالہ لڑکا نہ تھے بلکہ اکیس سالہ نوجوان تھے اس لئے پوری واردات بڑی ہی صفائی سے نظم کر دیتے ہیں ؎

اپنا جو ہوا کچھ اور ارادہ — جی چاہا کچھ اس سے بھی زیادہ
پھر کیا ہی ادا سے کچھ ادائی — کس ناز سے کرنی ہاتا پائی
وہ ہاتھ کو رکھ کے جوشِ انکار — وا کرنے نہ دینا بندِ شلوار
وہ ہاتھ کو دم بدم جھٹکنا — وہ تکیہ پہ سر کو دے پٹکنا
آہستہ لگانی آہ لاتیں — حیلے کی وہ کیسی کیسی باتیں
وہ ہاتھ کو زور سے چھڑانا — وہ ہو کے بتنگ کاٹ کھانا
ہر جائے کہ چٹکیاں وہ لینی — آزردہ ہو گالیاں وہ دینی
وہ نیچے پڑے ہی تلملانا — قابو سے تڑپ کے نکلے جانا

اس مثنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کی مشق سخن خاصی ترقی کر گئی تھی اور وہ موٹے موٹے الفاظ بھی کم استعمال کرتے ہیں اور لطافت خیال و علوئے تخیل کے ساتھ معاملہ بندی اور زبان کی صفائی کی طرف بھی زیادہ توجہ کرتے ہیں اور سلاست و روانی بھی خاصی پیدا کر لی ہے،

۱۲۳۶ھ میں تیسری مثنوی "قول غمیں" کہی جاتی ہے جو مومن کا شاہ کار ہے، اب مومن کی عمر بائیس سال ہو چکی ہے، اور مشق سخن بھی سات آٹھ برس کی ہے اس لئے طبیعت خاصی ہموار ہو گئی ہے دیکھیے کیا شاندار آغاز ہے ؎

ساقیا زہر پلا دے مجھ کو! | شربت مرگ چکھا دے مجھ کو!
ہاں سیہ مستیٔ حرماں یہ نگاہ | دے وہ مے جیسے کف ماہ سیاہ
تلخیٔ یاس عبادت کب تک؟ | حسرت ذوق شہادت کب تک؟
کیا ذرا سودۂ الماس نہیں؟ | سم ہلاہل ترے کچھ پاس نہیں؟
گر یہاں ہے تو اٹھا لا جلدی! | اور نہیں پاس تو جالا جلدی!
کیا خمار خفقاں ہے ظالم | بس چلا جی تو کہاں ہے ظالم!
بھر دے اک جام کہ مر جاؤں ابھی | بھول کر آپ میں آؤں نہ کبھی
کاسۂ عمر کا بھرنا اچھا | ایسے جینے سے تو مرنا اچھا
کاش مر جاؤں کہ چین آئے کہیں | بد دماغی سے سر زیست نہیں
کب تلک نزع کی حالت میں رہوں | کب تلک یوں ستم مرگ سہوں
کب تلک نالہ دم آہ رہے | ورد لب نالۂ اللہ رہے

سابقہ دونوں مثنویوں کے برخلاف اس مثنوی میں مومن نے جدت کی ہے اور دوران قصہ میں غزلیں بھی کہی ہیں، چونکہ مثنوی مسلسل ہے اس لئے غزلیں بھی مسلسل ہیں، چونکہ مومن کو مسلسل شعر کہنے کی عادت ہو گئی تھی اس لئے غزلیں بھی مسلسل کہی ہیں، چونکہ مومن کا کوئی دیوان تاریخی ترتیب کے ساتھ مرتب نہیں ہوا ہے اور ہمیں ان کی کسی ابتدائی غزل کا علم نہیں ہے

اس لئے ہم اِسی غزل کو ان کی پہلی غزل تصور کریں گے۔

غزل

پھر محبت میں مزا آتا ہے
کیوں نہ کھائیں ہمیں غم بھاتا ہے

پھر کھجائے ہے ہتھیلی دیکھوں
سیم تن کونسا ہاتھ آتا ہے

مددِ اے کشمکش شوق کہ پھر
دل کہیں کھینچے لئے جاتا ہے

دل سے مطبوع مکاں میں ہر دم
جی پھر اب صبر کا گھبراتا ہے

عشق کی زمزمہ سنجی ہے ہے
ولولہ ناک میں دم لاتا ہے

کسی کی چشمک سے ہے اختر شری
فلک آنکھیں مجھے دکھلاتا ہے

ہے غمِ پردہ نشیں جوں ناصح
پھر زباں کھولتے شرماتا ہے

کس سے پھر وعدۂ وصلت ہے کہ دل
میرے ملنے کی قسم کھاتا ہے

پھر ہوں دیوانہ و بیخود کس کا
خار تلوے مرے سہلاتا ہے

پھر دل اس بت کو دیا مومن نے
وہ کب ان باتوں سے باز آتا ہے

اسی مثنوی میں دوسری غزل یہ ہے ؎

کیا لگا دستِ دل آرام سے ہاتھ
دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ

کس کے ہاتوں سے لگا تھا کہ جدا
نہیں ہوتا دلِ ناکام سے ہاتھ

پختہ مغزان جنوں سے ہوں میں
کیوں اٹھاؤں طمعِ خام سے ہاتھ

ہاتھ دیتے تو ہوا اب ہاتھ میں پر
کان پر رکھیے گا پھر نام سے ہاتھ

دھوئے شبنم سے نہ ہوگا ہمرنگ
ہر کا دستِ گل اندام سے ہاتھ

ہائے پہونچے نہیں ابھی پاؤں تلک
ایک شب گردشِ ایام سے ہاتھ

کیا کہوں آہ بقول مومن
دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ

پھر تیسری غزل بھی کہی ہے ؎

کاکلِ آشفتہ و پیچاں کیوں ہے — زلف کا حالِ پریشاں کیوں ہے
کس کے نالے نے بنا دی دم پر — زمزمہ ہمدمِ افغاں کیوں ہے
رنگ اڑائے گئیں کس کی آہیں — چہرہ جوں مہرِ درخشاں کیوں ہے
کس کی وحشت کا خدا صبر پڑا — شوخیِ چشمِ غزالاں کیوں ہے
غمزے نے کس کو رلایا بے باک — خارِ دامن سرِ مژگاں کیوں ہے
خندہ زن کس کا ہوا زخمِ دروں — شدتِ گریۂ پنہاں کیوں ہے
کس کے یہ متصل آنسو پونچھے — ہاتھ ہم پنجۂ مرجاں کیوں ہے
کون تلخی سے ہوا شیریں کام — بے مزہ شورِ نمکداں کیوں ہے
کس کا دل لیکے گنہگار ہوئے — خوار تر خشکیٔ داماں کیوں ہے
دلِ مومن سے ہوئی کیا صحبت — ہندوئے زلف پریشاں کیوں ہے

چوتھی غزل بھی بڑی ہی مزے دار ہے ؎

جلوہ اس بت نے دکھایا مجکو — کب قیامت میں غش آیا مجکو
سرمۂ دیدۂ خورشید ہوں میں — خاک میں کس نے ملایا مجکو
شعلہ رو اب تو اٹھا دے چلمن — سوزِ پنہاں نے جلایا مجکو
ناصح اس مہ کو کہے ہے لیلےٰ — تو نے دیوانہ بنایا مجکو
ہائے کس شوخ پہ جی لوٹے ہے — تپشِ دل نے ستایا مجکو
دیکھوں اس دولتِ دیدار کو میں — خواب کیسا نظر آیا مجکو
محوِ دیدارِ بت کافر ہوں — کیا ہوا ہائے خدایا مجکو
شکلِ بستر کے ہے بخت اپنے کہاں — اس نے کب ساتھ سلایا مجکو
ہم کو رنجِ شبِ ہجر نصیب — وصل کا دن نہ دکھایا مجکو
منہ کو مومن سے چھپانا کافر — یہ تقیہ تو نہ بھایا مجکو

پانچویں غزل تو بس غضب کی ہے ؎

بو کچھ آتی ہے صبا سے تیری — ناک میں دم ہے جفا سے تیری
بس لگا لے مجھے چھاتی سے اب — تنگ تر ہوں میں قبا سے تیری
غیر کو بھی ہے عذابِ شبِ غم — کوئی مر جائے بلا سے تیری
جوشِ وحشت ہے یہی تو اک دن — الجھیں گے زلفِ دوتا سے تیری
کیونکر حسرت سے فلک کو دیکھوں — شرم آتی ہے حیا سے تیری
نہ سنا رنجِ شبِ غم ہے ہے — دشمنی اہلِ وفا سے تیری
آج ہمرنگ حنا ہے گریہ — مل دوں آنکھیں کفِ پا سے تیری
ہجر میں ہے قلقِ جاں شکنی — حیرتِ روح فزا سے تیری
مومنؔ اس بت سے بگڑنا ہی نہ تھا — بن گئی بات خدا سے تیری

یہ عاشقی تھی امۃ الفاطمہ صاحب جی کے ساتھ کیونکہ وہ دلی آئی ہوئی تھیں چند روز بہ تقریب علاج مومن سے بھی صحبت رہی۔ مومنؔ نے مسیحائی کی صاحب جی کا مرض تو جاتا رہا مگر مومن کو روگ لگ گیا چند مہینے کے بعد وہ تو بھلی چنگی ہو کر چلی گئیں مگر مومن کا برا حال ہو گیا انھیں کے فراق میں جلتے اور مثنوی کہتے رہے جسے یوں ختم کیا ہے ؎

لوگ جا کر بھی تو پھر آتے ہیں — گاہ بچھڑے بھی تو مل جاتے ہیں
مومنؔ زار کہ تھا گرم بیاں — سوزشِ سینہ سے تھا شعلہ فشاں
دل کی آتش سے جلا خاک ہوا — بجھ گیا شعلہ بھڑک کر دل کا
آتشیں نالہ زد و رفت ز ہوش — ہمچو شمع سحری گشت خموش
ختم المومن نوحاً حزنیٰ — ختم باللہ لہ بالحسنیٰ

اس مثنوی کا ایک شعر تو ضرب المثل بن گیا ہے اور ہر اردو داں کی زبان پر ہے مگر کسی کو یہ معلوم نہیں کہ یہ شعر مومنؔ کا ہے ؎

کون سنتا ہے فغانِ درویش — قہرِ درویش بجانِ درویش

مثنوی کہہ کر بھی دل کی بھڑاس نہیں نکلی تو مومن نے ایک فارسی تاریخی قطعہ بھی کہا ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ۱۲۳۶ھ میں فارسی کس مزے سے کہتے تھے اور تاریخ بھی بڑی ہی نفیس نکالتے تھے ملاحظہ ہو ؎

تارفتہ است دلبر من از دیار من   از درد و غم بہ حالت مردن رسیدہ ام

آن آہوی حرم کدۂ حسن یوسفی   از من رمیدہ است و من از خود رمیدہ ام

ہمراہ او نہ رفتہ ام از پاس عرض او   با آنکہ راہ دشت و بیاباں بریدہ ام

جلا دنیم کشتہ زبالین من گزشت   خوں یاد جذب دل کہ بخود در طپیدہ ام

اے تیرہ روسپہر رخ مہر و مہ سیاہ   دیدی کہ روئے دم رفتن نہ دیدہ ام

نے گفتہ ام بیار غم دلگداز خویش   نے حرف جاں فزا ز لب او شنیدہ ام

سوزم بداغ ہجر ہمانا دل خودم   غلطم بخاک و خوں مگر اشک چکیدہ ام

پژمردہ غنچہ ایست گل اخترم کہ گاہ   از باغ آرزو گل وصلے نہ چیدہ ام

نازم بہ بخت جانی خود زندہ ام ہنوز   با آنکہ زہر تلخی ہجراں چشیدہ ام

برپا قیامتے شد و جانم ز تن نہ رفت   صد بار صور نالہ و افغاں دمیدہ ام

وا ماندہ ام کجاست مقام تو اے اجل   صد رہ بہ جستجوئے تو ہر سو دویدہ ام

یارب چہ شاعری و چہ سنگین دلیست ایں   گاہے ز ہیچ کس نشنیدم نہ دیدہ ام

بے درد مومن از پئے تاریخ سر بجیب   بر وا ست و من ز درد گریباں دریدہ ام

تاریخ و تخرجہ بنالش رسید و من   و سینہ چاک از غم دوری کشیدہ ام

۱۲۳۶ھ

(غم دوری میں سے سینہ چاک کا تخرجہ ہے)

اس مثنوی کی چوتھی غزل کا مقطع ہے ؎

سنہ کو مومن سے چھپانا کافر   یہ تقیہ تو نہ بھایا مجھ کو

چونکہ امۃ الفاطمہ شیعہ گھرانے کی خاتون تھیں اس لئے ان پر یہ طنز مومن نے کی ہے ان کے دیوان میں بھی ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے ؎

لگے خدنگ جب اس نالہ سحر کا سا | فلک کا حال نہو کیوں مرے جگر کا سا

اور اسی غزل کا مقطع ہے ؎

دل ایسے شوخ کو مومن نے دیدیا کہ جو ہے | محب حسینؑ کا اور دل رکھے شمر کا سا

غلبۂ فراق اور بدحواسی میں شمر کو اس طرح باندھ دیا ہے ورنہ اصل میں شمر بسکون میم ہے مومن سے اس تصرف پر لوگ ناک بھوں چڑھاتے رہے مگر مومن آخر مومن تھے ایک دفعہ جو کہدیا سو کہدیا اور پھر مستند ہے میرا فرمایا ہوا کہہ کر چپ ہو رہے'

ایک قصیدہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی منقبت میں کہا ہے جس کا مطلع ہے ؎

جو اسکی زلف کو دوں اپنے عقدۂ مشکل | تو بوالہوس کا بھی ہرگز کبھی نہ چھوٹے دل

اور مطلع ثانی ہے ؎

دل اب کی بار ہوا ایسی بے جگہ مائل | کہ جان کو بھی ٹھکانے لگا رہیگا دل

اسی سلسلہ میں کہا ہے ؎

وہ شوخ بے سبب آزار بے گنہ خوں ریز | کہ جرم قاتل عثمانؓ کا نہ ہو قائل

وہ نکتہ داں کہ تقیہ کو اصل دین کہے | دم شکایت عاشق نہو جفا سے خجل

وہ دور بیں کہ خدا پر کرے بدا ثابت | نہیں ہے غیر زبس اعتماد کے قابل

وہ کج ادا صنم خود پرست کافر کیش | کہ جس کے زعم میں باطل حق اور حق باطل

وہ فتنہ گر بت حق نا شناس نا انصاف | جو فرض میں گنے کین داد رفادل

سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شعر بھی امۃ الفاطمہ ہی کی شان میں کہے گئے ہیں' اور یہ قصیدہ بھی ۱۲۳۶ھ کا کہا ہوا ہے'۔

مومن نے ایک نامہ منظوم بھی کہا ہے جس کا پہلا شعر ہے ؎

اے گل گلستان رعنائی نو بہار ریاضِ زیبائی

اور آخری شعر ہے ؎

تو جو ہے ہاشمی نسب اے جان ہے محبت تری مرا ایمان

ممکن ہے کہ یہ شعر بھی امۃ الفاطمہ کے لئے کہا گیا ہو مگر یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا البتہ مثنوی کے ساتھ قطعۂ تاریخ اور غزل اور قصیدے کے شعر یقین کے ساتھ پیش کئے جا سکتے ہیں۔

ان اشعار کو پیش کر کے یار لوگوں نے شیعوں کو مومن کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی ہے، یہ نہ تو شیعوں کے عقائد پر اعتراض ہے اور نہ شیعوں پر طنز ہے یہ صرف اپنی محبوبہ کی بد خلقی بد مزاجی اور اختلاف طبع کا دکھڑا ہے جو بالکل شخصی چیز ہے، یہ صرف نوک جھونک ہے اور کچھ نہیں اسے مذہب سے کیا سروکار اور عام شیعوں سے کیا کیونکہ مومن کے مذہب عشق میں ان باتوں کو اہمیت دینے والا کافر ہے، بھلا مومن ایسی حرکت کس طرح کرتے'

بعض لوگوں نے امۃ الفاطمہ کے تعلق سے بعض افسانے بھی گھڑ ڈالے ہیں، چنانچہ یہ تک مشہور کر دیا ہے کہ امۃ الفاطمہ آزاد کے گھرانے کی تھیں اس لئے آزاد مومن سے خفا تھے یہ بالکل غلط اور سراسر بہتان ہے، حکیم آزاد انصاری نے ایک لمبا چوڑا افسانہ سنایا تھا' جسے جوش ملیح آبادی اور مالک رام بھی سن چکے ہیں مگر یہ محض افترا ہے'

امۃ الفاطمہ کسی شریف گھرانے کی خاتون تھیں بد نصیبی سے مومن سے پھنس گئیں ان کے متعلق لوگوں نے عجیب و غریب افسانے مشہور کر دیئے کسی نے طوائف بتایا کسی نے خانگی کہا کسی نے کچھ کہا ہے۔ نواب مصطفیٰ شیفتہ' مومن کے یار غار اور ہم نوالہ ہم پیالہ اور راز دار تھے انہوں نے لکھا ہے۔

"امۃ الفاطمہ بیگم مشہور بصاحب جی کہ وہ آسمان نکوئی است آفتاب صورت از شرق بجانب مغرب آمدہ بتقریب مداوا با مومن خاں کارش افتاد ماہی چند کار با درد و دوا بود سالہا ست کہ باز بہ لکھنؤ رفت مثنوی قول غمیں نام کہ از

مصنفات خاں معز اللہ است شرح نسخہ حسن و جمال ہماں موزوں قد است؎"

اگر صاحب جی خانگی یا طوائف ہوتیں تو شیفتہ ضرور اشارتاً کچھ نہ کچھ لکھ دیتے ان کا کچھ نہ لکھنا صاف ظاہر کر رہا ہے کہ وہ کسی اچھے گھرانے کی تھیں،

معاف کیجیے، صاحب جی کا قصہ مومن کی عاشقی کے سلسلہ میں آنا چاہیے تھا مگر میں نے شاعری کے ضمن میں لے لیا ہے اور چونکہ "حکایت لطیف" تھی اس لیے ذرا لمبی ہو گئی ہے،

غرض ۱۲۳۶ھ میں مومن خاصے مشاق ہو گئے تھے اور خوب شعر کہتے تھے، یہ تو مثنویوں سے ہم نے مومن کے ابتدائی کلام کے نمونے دیئے ہیں مگر دیوان کا مطالعہ اسی طرح کیا جائے تو پھر بیشتر غزلیں ابتدائی زمانے کی ملتی ہیں،

سرسری طور پر چند شعر مومن کے ابتدائی کلام سے نقل کیے جاتے ہیں ؎

مومن عاشق طبیعت نوجواں ہی مر گیا
عشق طفلِ چند سالہ دشمن صد سالہ تھا

خاک اڑائی میں نے کیا طرز جنون قیس کی
شہ جہاں آباد سارا نجد کا بن ہو گیا

اس نام کے صدقے جس کی دولت
مومن رہوں اور بتوں کو چاہوں

اگرچہ شعر مومن بھی نہایت خوب کہتا ہے
کہاں ہے ایک معنی بند مضموں یاب اپنا سا

مومن تجھے تو وہم ہے مومن ہی وہ نہیں
جو معتقد نہیں تری طبع سلیم کا

مومن اسی نے مجھ سے دی برتری کسی کو
جو پست فہم میرے اشعار تک نہ پہنچا

حق تو یہ ہے کیا پڑھی اک اور مومن نے غزل
آج باطل سارے استادوں کا دعویٰ ہو گیا

ایسی غزل کہی ہے کہ جھکتا ہے سب کا سر
مومن نے اس زمین کو مسجد بنا دیا

مومن سے اچھی ہو غزل اتنا اٹھے یہ زور و شور
کیا کیا مضامین تاہم کس کس ہنر باندہ کر

اک اور پڑھ وہ مومن شعلہ زباں غزل
جل جائیں جس کے رشک سے حاسد بساں شمع

۵ا گلشن بے خار ص ۱۲۳،

شعر تر وہ ہیں مرے مومن کہ ہنگام جواب
خون سے منہ اور زباں ہر سخن ور خشک ہے

مدت سے نام سنتے تھے مومن کا بارے آج
دیکھا بھی ہم نے اس شعراء کے امام کو

یار مومن سے ہی ہیں مدعیٔ طبع رواں
واہ انکا دہ تران او مغہ یا بس کے

عبث ترقی فن کی ہوس ہے مومن کو
زیادہ ہوئیگا کیا اس سے بے مثال تجھے

یہ ابتدائی عشق کا زمانہ تھا نو جوانی کی ترنگ تھی طبع رواں کا زعم تھا اس لئے جا و بیجا طعن و طنز کرتے رہتے تھے اور اپنی استادی کا ڈنکہ بجاتے تھے۔

اسی زمانے سے مومن نے ناسخ کی اتباع شروع کی مگر جس طرح انہوں نے چند روز چند غزلیں شاہ نصیر کو دکھاکر چھوڑ دی تھیں، اسی طرح ناسخ کی اتباع بھی چھوڑ دی اور میر کی تتبع کرنے لگے۔

عشق و عاشقی

مومن کو اگر مادر زاد عاشق کہا جائے تو بجا ہے کیونکہ انہوں نے اس زمانے میں عاشقی کی ہے جب کہ دوسرے لڑکوں کو بات کرنے کا شعور بھی نہیں ہوتا، بقول قیس عامری ؂

تعشقت لیلیٰ وہی غیر صغیرۃ
وکنت ابن سبع مابلغت الثمانیا

(میں لیلیٰ کے عشق میں اس وقت مبتلا ہو گیا تھا جب وہ بھولی بھالی کمسن تھی اور میں سات برس کا تھا آٹھواں سال شروع نہیں ہوا تھا)

ابو نواس کہتا ہے ؂

اتانی ہواہا قبل ان اعرف الہوی
فصادف قلباً فارغاً فتمکنا

(مجھے اس سے اس وقت محبت ہو گئی جب میں نہیں جانتا تھا کہ محبت کیا ہے اس نے میرا بھولا بھالا دل پاکر قبضہ کر لیا)

اور مومن کو اعتراف ہے ؎

یعنے طفلی سے ہوں میں پیر مغاں | بلدِ راہ گمرہان جہاں
تھے برس ہم شمارۂ افلاک | کہ ہوا پائمال صورتِ خاک

پہلی عاشقی انھوں نے آٹھ برس کی عمر میں کی اور چند روز کے بعد ہی مبتلائے فراق ہو گئے اور مدتوں روتے رہے، اس کے بعد دوسری عاشقی بارہ سالہ عمر میں کی ؎

سالِ عمر اب تھے ہم شمارہ بروج | کہ ہوا اخترِ بلا کا عروج

ایک نئی محبوبہ نے دلدہی شروع کی اور خوب عیش مناتے رہے ؎

اک برس تک یہی رہا عالم | زندگی کے مزے اُٹھائے بہم
بعد یک سال خصم دیرینہ | چرخ بیداد گر زمیں کینہ
آگیا اپنی کج خرامی پر | غش ہو وا ز گونہ کامی پر

کسی نے طالب و مطلوب کو ؎

گلے لپٹے پڑے ہوئے باہم

دیکھ لیا اور پھر ہنگامہ بپا ہوا، گھر والوں نے خوب لے دے کی اور مومن مبتلائے فراق ہو گئے بالآخر پھر ملاقات ہوئی اور روز راتوں کو ملاقات کی تجدید ہونے لگی، کئی بار آپس میں اختلاف ہوا رکاوٹیں رہیں، مگر پھر مل گئے، بالآخر ایک کٹنی درمیان میں آئی اس کے ذریعہ پیام و سلام ہونے لگے اور وہی آکر بلانے اور ساتھ لے جانے لگی، ایک روز مومن دیوان خانہ کا دروازہ بند کئے شعر کہنے میں مشغول تھے کہ وہ بڑھیا آئی اور اس نے آواز دی تو مومن نے دیوان خانہ کا دروازہ نہیں کھولا، اس پر وہ خفا ہو کر چلی گئی اور مومن کی محبوبہ کو یہ باور کرا دیا کہ تو جس کو چاہتی ہے وہ کسی اور کو لئے کمرہ بند کئے بیٹھا ہے، یہ سن کر محبوبہ نے دو دن کٹ کر لی ان دونوں حادثوں کو مومن نے اپنی پہلی مثنوی شکایت ستم میں تفصیل سے بیان کیا ہے جو ۱۲۳۱ھ میں کہی گئی ہے، اس وقت مومن کی عمر سترہ برس کی تھی۔

اس کے بعد ایک اور جگہ دل لگایا مگر جلد ہی یہ قصہ ختم ہو گیا، اور اس کی تفصیل مومن نے مثنوی دوم "قصہ غم" ۱۲۳۵ھ میں تفصیل سے لکھی ہے،

۱۲۳۶ھ میں تیسری مثنوی میں جس کا نام "قول غمیں" ہے اپنے ایک معاشقہ لطیف کا ذکر جمیل کیا ہے، یہ عاشقی امتہ الفاطمہ صاحب جی سے ہوئی تھی جس کا تفصیلی تذکرہ ہم نے سابقہ اوراق میں کیا ہے،

۱۲۴۱ھ میں مومن نے مثنوی "تف آتشیں" لکھی ہے جو ان کی چوتھی مثنوی ہے، مومن کے خاندان میں کسی کی شادی تھی، اور مومن شادی کے اہتمام میں مصروف تھے، آمنا سامنا ہو گیا اور پینگیں بڑھیں مگر جوں ہی دعوت ختم ہوئی افتراق ہو گیا اور سے

طور بہ ظاہر مرنے کے سارے چار مہینے یوں ہی گزارے

اور پھر ایک عزیز کے گھر میں ملاقات ہونے کی تقریب بنی مگر اس قتالۂ عالم نے ملنے سے انکار کر دیا، اور یہ رو پیٹ کر بیٹھ رہے،

۱۲۴۴ھ میں پانچویں مثنوی "حسنین مغموم" میں اپنی ایک عاشقی کی روداد مومن نے بیان کی ہے، اور پاکدامن کے ہجر میں خوب واویلا مچایا ہے مگر وہ تو ہاتھ نہ آئی بلکہ ایک اور چھیل پائی کی طبیعت مومن پر آگئی جس سے انہوں نے فرار ہو کر پیچھا چھڑا لیا، بالآخر ایک جگہ جمع حسیناں تھا وہاں پہونچے تو ایک کو دل دے بیٹھے اور پھر ساتھ ہی ساتھ روابط بھی قایم ہو گئے، مگر وہی چھیل پائی جو مومن پر عاشق تھی حائل ہو گئی اور اس محبوبہ کو بھڑکا کر دشمن بنا دیا۔

۱۲۴۶ھ میں چھٹی مثنوی آہ و زاری مظلوم" لکھی ہے جس میں اپنی ایک عاشقی اور ناکامی کا بیان ہے۔ غرض ۱۲۳۱ھ سے ۱۲۴۶ھ تک کا رونا عشق و محبت مومن نے قلمبند کر دی ہے، معلوم نہیں ان کے علاوہ اس پندرہ سولہ سال کے عرصے میں اور کتنی عاشقیاں ہوئی ہیں، یہ تو معشوقہ ہیں غیر معشوقہ کا پتہ نہیں۔

مومن نہ صرف خوش رو، خوش پوش، خوش مزاج اور خوش ادا تھے بلکہ حکیم، نجومی، رمال، عامل، بھی تھے پھر متمول اور مرفہ الحالی سب پر طرہ تھی، ان تفریحی مشغلوں سے جو فائدے اٹھائے جا سکتے تھے وہ اٹھاتے رہے، اور اپنی بہترین صلاحیتوں کو برباد کیا، اسی لئے تو مولوی فضلِ حق کہا کرتے تھے کہ مومن ایک ایسا بھیڑیا ہے جسے خود اپنی قوت کا اندازہ نہیں وہ عشق و عاشقی کی چکر میں پھنس کر برباد ہوا،

مومن نے اپنی مثنویوں میں جو قصے عاشقی کے بیان کئے ہیں، ان کے علاوہ معلوم نہیں اور کتنے واقعے ہیں جو شرمندۂ تحریر نہ ہو سکے، مومن نے شادیاں بھی کی تھیں چنانچہ انشائے مومن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے عظیم اللہ بیگ کی لڑکی سے عقد بھی کیا جو سرہند کے رہنے والے تھے مگر یہ شادی خانہ آبادی نہ بن سکی بلکہ بہت جلد افتراق ہو گیا، اور مومن نے کسی اور سے دل لگایا، غرض مومن نے چالیس سال تک "کاروبار عاشقی" کو انجام دیا ہے اور اس عرصے میں وہ سب کچھ کر لیا جس کی ہوس اور لوگوں کو بھی تھی کیونکہ جو لیلیٰ اوروں کیلئے محمل نشیں تھی مومن کے پہلو نشین رہی ہے،

بہر حال مومن نے جن ان گنت معشوقوں سے دل لگایا ان میں سے چند مر گئیں چند بھاگ گئیں چند کو خود مومن نے چھوڑ دیا اور چند سے یاد اللہ رہی، چنانچہ ہمارا امام الشعراء[1] ایک امامن پر بھی مٹا ہوا تھا جو داغِ مفارقت دے گئی، اس کی تاریخ وفات کہی ہے ؎

خزاں دیدہ شد نوگلی در جوانی — جدائی چنیں بلغ امکاں ندارد
دریغا کہ جانِ جہاں دلربائے — بخاک از جہاں رفتہ جاں ندارد
امامن کہ مانند از بعتی خوش — پس پردہ گردوں گرداں ندارد
دمیدار چہ سنبل زخاک مزارش — خم و پیچ آں زلف پیچاں ندارد

---

[1] مومن اپنے آپ کو امام الشعراء بھی کہتے تھے — مدت سے نام سنتے تھے مومن کا بارے آج
دیکھا بھی ہم نے اس شعراء کے امام کو

اگر از زمیں سر فرو بردہ نرگس — اشارات آں چشم فتاں ندارد
کرا دل کشاید ز سیر گلستاں — چناں رقص طاؤس بستاں ندارد
چنیں نغمۂ تازہ و نقش دلکش — لب عندلیب خوش الحاں ندارد
کجا بت پرستی کہ یارب نسنجد — کجا عشق بازی کہ افغاں ندارد
چو امید وصلش بمردن فتادہ — خوشا دردمندی کہ درماں ندارد
چگویم ز سال وفاتش چگویم — غم و رنج و آزار پایاں ندارد

۵۹ ہ ۱۲

اما من تو خیر کوئی عارضی محبوبہ تھی ہو گی مگر کوئی منکوحہ بھی جنت نشیں ہو کر مومن کو مبتلائے غم کر گئی تھی جس کا مرثیہ بطور ترکیب بند بڑا ہی درد انگیز کہا ہے اور مرثیہ کے عنوان میں حصلتہ دعا لہا فی جنت النعیم لکھ کر جنت میں ملنے کی تمنا بھی کی ہے، اس میں مرحومہ کو اپنی "ہم خوابہ" لکھا ہے جس سے یقین ہوتا ہے کہ یہ منکوحہ ہی ہو گی، یہ بارہ بند کا ترکیب بند ہے جس کے ایک سو تیس شعر ہیں اور ہر شعر تیر و نشتر ہے، نمونتہً چند شعر نقل کرتا ہوں ۔

خمیازہ عیش کا مرا دل کھنچتا ہے آج — آغوش رشک حلقۂ اہل عزا ہے آج
برباد شور رعد ہوا آب اشک پر — کیسا و فور شیون و جوش بکا ہے آج
جیتے رہے تو لال تماچوں سے منہ کیا — تغیر رنگ شرم و خجالت فزا ہے آج
پانی کے بدلے منہ میں بھر آئے ہے لہو — لب کاٹنے میں ہائے کہاں وہ مزا ہے آج
مجھ کو نہ اپنے ساتھ عدم میں لے گیا — ہر دم شکایت نفس نارسا ہے آج
پیٹے مجھے جو روئے وہ کہتے تھے بارہا — کیا روئیے اسی کا ہمیں مدعا ہے آج

آٹھواں بند بڑا ہی الم انگیز ہے ۔

کھو دی خزاں نے رونق گلزار ہائے ہائے — پژمردہ ہو گئے گل رخسار ہائے ہائے
پھر قید تھی جو پردہ نشیں گھر میں بے حجاب — نعش اسکی جا کے ہے سر بازار ہائے ہائے

سرو قد وہ قامتِ محشر خرام ہے
کیا ہو گئی وہ شوخیٔ رفتار ہائے ہائے

ہم خوابِ مہ جبیں کی مری آنکھ مند گئی
کیا سو گئے ہیں طالعِ بیدار ہائے ہائے

ہے کچھ خبر بھی گھر مرا ویران ہو گیا
سر پھوڑ رو اپنا اے در و دیوار ہائے ہائے

اب پوچھے مجھ سے عاشقِ بیکس کی بات کون
اس میں نہیں ہے طاقتِ گفتار ہائے ہائے

نویں بند کے چند شعر بھی سن لیجئے کتنے رقت خیز ہیں ؎

مدفن بنے زمینِ چمن ہوا مصیبتا
محدوم ہو غنچہ تنگ زمین وا مصیبتا

جس نازنیں صنم پہ گراں تھا حریرِ چیں
اس کا غلافِ کعبہ کفن وا مصیبتا

دے منکر نکیر کو نا چار وہ جواب
جو حور سے کرے نہ سخن وا مصیبتا

جس کو شکستنِ دلِ عاشق عذاب ہو
وہ اور جاں کنی کے محن وا مصیبتا

وہ خانہ باغِ عیش محل جس کا نام تھا
کہتے ہیں اس کو بیتِ حزن وا مصیبتا

بارھویں بند کے آخری چار شعر تو بڑے غضب کے ہیں ؎

تاثیر کو بھی آ گئی موت اس کے ساتھ ہائے
کھا کر کروں امیدِ اثر سم کہاں تلک

اس زندگی سے میرا دم آیا ہے ناک میں
آخر تحملِ قلق و غم کہاں تلک

اللہ سینہ کوبیوں سے ہاتھ تھک گئے
پیٹوں گا اپنی جان کو یوں ہائے کہاں تلک

اے مرگ اس عذاب سے آکر چھٹا مجھے
مومن ہوں قید خانہ ہے دارِ فنا مجھے

اگر مومن اس عشق و عاشقی کے کھیل کو چوری چھپے کھیلتے تو ان کی بدنامی اس قدر نہ ہوتی مگر وہ ذرا سخت مزاج تھے اور بھولے آدمی بھی اس لئے انہوں نے ان قصوں کو چھپایا نہیں بلکہ ظاہر کرتے رہے۔ اسے وہ اپنی بے عزتی کا باعث بھی نہیں سمجھتے تھے اس کے اظہار میں انہیں شرم بھی محسوس نہ ہوتی تھی اسی وجہ سے انہوں نے بے جھجک ساری روداد بیان کر دی ہے یہ جرأت رندانہ اردو شعراء میں صرف دو میں نظر آتی ہے پہلے مومن اور دوسرے

داغ، مگر داغ پھر بھی "کچھ" ظاہر کر کے "بہت کچھ" چھپاتے تھے لیکن مومن نے سب کچھ ظاہر کر دیا اور کچھ نہیں چھپایا یہ ان کی بلند کرداری اور جرأت اخلاق ہے، آپ فرمائیں گے ایک تماش بین آوارہ عاشق مزاج ہرجائی کو اخلاق اور کردار سے کیا تعلق؟ میں یہ عرض کروں گا کہ اخلاق اور کردار کا اس میں بھی دخل ہے اگر کوئی شخص بلند خیالی بلند حوصلگی اور مضبوط ارادے سے عاشقی ہی کرتا رہے اس کے اصول مقرر کر لے اور ان اصولوں پر مضبوطی سے قایم رہے اور بغیر جھجک کے اپنی زندگی ان اصولوں پر گزار دے اور ان میں ثابت قدم رہے تو یہ اس کے اعلیٰ کردار کی دلیل ہوگی، کردار ایک پابندی ایک ضابطہ ایک اصول ایک عمل ایک ایقان کے استحکام کا نام ہے، چاہے وہ جذبہ کیسا ہی ہو، اس لئے مومن کو بھی ایک بلند کردار عاشق ماننا پڑے گا، جنھوں نے بڑے ہی وقار بڑی ہی تمکنت بڑے ہی طمطراق سے عاشقی کی اور نہایت ہی وضع داری سے نباہ دیا۔

مومن کا یہ کردار تھا کہ انھوں نے عاشق مزاجی کرتے ہوئے وضع بھی عاشقانہ رکھی نہ توجیہ وعمامہ کو پردہ بنایا نہ حکیمانہ شملے کی آڑ لی نہ عالمانہ تسبیح اور منجمانہ بساط بچھائی اور نہ گندم نما جو فروشی کی، اپنی کمزوریوں کو کمزوری سمجھ کر ظاہر کر دینا اور پھر وضع داری کے ساتھ اس پر قائم رہنا بھی ایک اخلاقی بلندی ہے، ہر کمزور طبیعت والا اور معمولی شخص ایسا نہیں کر سکتا اور پھر استقامت بھی تو فوق الکرامت ہے،

شادی

مومن کی شادی خواجہ ناصر پرست عرف میر کلو اکبر آبادی کے بیٹے اور خواجہ میر درد کے نواسے خواجہ محمد نصیر رنج کی بڑی صاحبزادی انجمن النساء بیگم سے ہوئی[1]، خواجہ محمد سنہ ۱۸۹ میں

---

[1] میخانۂ درد ص ۱۹۵۔

دہلی میں پیدا ہوئے خواجہ میر درؔد ہی سے تعلیم و تربیت پائی اور بارہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر اپنے نانا خواجہ میر درؔد سے بیعت ہوئے خواجہ میر درؔد کے انتقال کے بعد اپنے ماموں خواجہ ضیا الناصر الم سے ریاضیات موسیقی وغیرہ میں کمال پیدا کیا، بلا کے ذہین اور طباع تھے بڑے بڑے استاد ان کے سامنے کان پکڑتے اور خاک چاٹ کر نام لیتے تھے، خواجہ الم کے بعد ۱۲۱۵ھ میں ان کے جانشین ہوئے ہر قمری مہینے کی دوسری اور چودھویں تاریخ کو بین نوازی کی مجلس کرتے تھے جس میں دور دور کے فن داں جمع ہوتے تھے شعر و سخن کا ذوق بھی تھا اور شعر خوب کہتے تھے[۱]

۱۲۳۹ھ میں مومنؔ کی شادی ہوئی جس کی تاریخ انہوں نے کہی ہے ؎

حیف صد حیف کہ در فصل بہاراں بلبل	ناگہاں گشت گرفتار بدام صیاد
آہ صد آہ کہ آوارگیٔ نکہت گل	باہمہ رنگ تجرد ہمگی شد برباد
یعنی آں مومنؔ آوارہ کہ در آزادی	بجہاں ضرب مثل بود چو سرو آزاد
ایں زماں پائے بہ زنجیر تعلق گشتہ	یوسفے بود مگر کار بہ زنداں افتاد
چہ خوش ایں واقعہ را گفت امیرؔ تاریخ	مرغ بے بال و پر اندر قفس آمد فریاد

(مرغ = ۱۲۴۰ سے بال و پر = ۲۰۲ کا تخرجہ اور پھر اس میں قفس = ۲۴۰ کا تدخلہ کر کے ۱۲۳۹ھ نکالے ہیں)

چوبیس سال کی عمر میں جو بقول مومنؔ فصل بہاراں تھی آوارگی ختم ہو گئی اور پابہ زنجیر تعلق ہو کر قفسِ عقد میں بند ہونا پڑا تو کیسے پھڑپھڑا رہے ہیں، یہاں یہی اپنی آوارگی اور آزادی ظاہر کی ہے "مومنؔ آوارہ جو دنیا جہان میں سرو آزاد کی طرح مشہور تھا" یہ بھی مومنؔ کی صاف دلی صدقِ گفتار اور بلندیٔ کردار ہے کہ اپنی کمزوری صاف صاف

---

[۱] تذکرۂ اہل دہلی

بیان کر دیتے ہیں۔

چونکہ مومن شیخ تھے اور خواجہ نصیر سید اس لئے اس شادی سے متعلق لوگوں کو حیرت تھی بلکہ بعض لوگوں نے تو یہ بھی مشہور کر دیا ہے کہ یہ شادی نتیجہ عشق ہے مگر یہ سراسر بہتان ہے، ناصر نذیر فراق نے اس شبہ کو رفع کر دیا ہے کہ

"خواجہ میر درد کے گھرانے میں ایک یہی دستور تھا کہ جہاں تک بن پڑتا اپنی اولاد کا بیاہ اور شادی بیاہ آپس ہی میں کرتے تھے نہ ہو غیروں میں سے لاتے نہ لڑکی غیروں میں دیتے تھے مگر جب مجبوری ہوتی تو غیروں میں بھی تعلق پیدا کرتے تھے، مگر صرف شیخ سیدوں میں کیونکہ شیخ سید اصل میں ایک ہیں ان شیخ سیدوں کے نسب کی خوب چھان بین کر لیتے ہیں"[۱]

مومن کے تعلقات اپنے خسر خواجہ نصیر سے بہت اچھے تھے کیونکہ دونوں بھی نہایت ذہین اور طباع تھے اور ایک دوسرے کے معترف بھی چنانچہ آزاد لکھتے ہیں،

"ان (مومن) کی تیزی اور ذکاوت طبع کی تعریف نہیں ہو سکتی وہ خود بھی ذہانت میں دو شخصوں کے سوا کسی ہمعصر کو تسلیم نہ کرتے تھے ایک مولوی اسمٰعیل صاحب دوسرے خواجہ نصیر

خواجہ محمد نصیر کہ ان کے خسر اور خواجہ میر درد کے نواسے تھے[۲]۔ خواجہ نصیر کے چند شعر نقل کرتا ہوں ؎

اپنا وہ تھا جس سے بیگانہ رہے نادانی سے	بیگانہ وہ تھا جس کو جانا اپنا یہ کیا تُو نے کیا
خط دیکھ کے ادھر تو مرا دم الٹ گیا	قاصد اُدھر بہ دیدۂ پُرنم پلٹ گیا
یقیں ہو گیا دیکھ کر اس کی قامت	کہ بے شک قیامت میں دیدار ہوگا
تیرے ہیں جب تک کہ دم میں دم رہا	آہ اور نالہ ہی بس ہمدم رہا
کمرے کی دیکھ لی جانب دشمن نہ بام پر	کو ٹھے چڑھی جو بات کھلی خاص و عام پر

---

[۱] میخانۂ درد صفحہ ۲۱۳۔ [۲] آب حیات صفحہ ۵۲۹

دل یہ جس کے لئے پہلو میں تپاں رہتا ہے ۔۔۔ یوں سنا ہے کہ اُسے بھی خفقان رہتا ہے
آنکھ سے آنکھ جب دو چار ہوئی ۔۔۔ زندگی سخت ناگوار ہوئی[۱]

خسر کی وفات اور مقدمہ بازی

مومن کے خسر خواجہ محمد نصیر رنج نے ۲ شوال سنہ ۱۲۶۱ھ کو انتقال کیا مومن نے تاریخ کہی ؎

شیخ زماں شد ز دہر زیبِ سالِ وفات ۔۔۔ فکر بلندم رہ جنت ماوی گرفت
گفت بہ مومن ملک خواجہ محمد نصیر ۔۔۔ در قدم ناصر و درد نکو جا گرفت
۱۲ ۶۱

خواجہ نصیر کی دو بیویاں تھیں ایک بیوی سے خواجہ ناصر جان محزون اور نصیرہ بیگم تھیں اور دوسری بیوی سے انجمن النسا بیگم اور اشرف النسا بیگم تھیں،

خواجہ ناصر جان بھی شاعر تھے محزون تخلص کرتے تھے انہوں نے سنہ ۱۲۴۹ھ ۱۸۴۶ء میں انتقال کیا، ان کی ایک صاحبزادی عمدہ بیگم تھیں جو سید محسن علی گلاوٹھی سے بیاہی گئیں جن سے ناصر نذیر فراق دہلوی تھے،

نصیرہ بیگم کی شادی سید خانِ دوراں سے ہوئی جن کے ایک فرزند ناصر امیر تھے جن کے بیٹے ناصر وزیر اور بیٹی فرحت النسا بیگم تھیں جو صاحب اولاد ہوئیں،

دوسری بیوی کی بڑی صاحبزادی انجمن النسا بیگم مومن سے بیاہی گئیں اور چھوٹی صاحبزادی اشرف النسا بیگم کا عقد سید یوسف علی مدراسی سے ہوا، چونکہ خواجہ نصیر کے نواسے ناصر امیر کم سن تھے اس لئے مومن کے ہم زلف سید یوسف علی صاحب سجادہ نشین ہوئے سید یوسف علی سے متعلق سر سید لکھتے ہیں۔

"مولوی یوسف علی سلمہ اللہ تعالیٰ سجادہ نشین حضرت خواجہ محمد نصیر علیہ الرحمۃ کے

---

۱ خمخانۂ جاوید جلد سوم ص ۵۰۷، واقعات حکمت دہلی ص ۳۹۸ مقدمۂ دیوان درد ص ۵ میخانۂ درد ص ۱۹۵

ہیں انکے اوصاف حمیدہ لاتعد ولاتحصیٰ ہیں، خامۂ راقم کو طاقت نہیں کہ ان کے محامد اور مناقب کو لکھ سکے حضرت سادات کبار سے ہیں اور صاحب اخلاق پسندیدہ اور مرتاض، ان کی سجادہ نشینی سے اس خاندان کو زیب و زینت اور بھی ہو گئی ہے، سن شریف آپ کا قریب چالیس سال کے ہے راقم نے ان حضرت کے جمال باکمال سے اپنی نگاہ کو گلچین نظارہ اور ان کے اوقات کو بچشم مشاہدہ کیا ہے" [1]

سرسید نے میر ناصر احمد کے حالات کے ضمن میں پھر لکھا ہے،

"حضرت خواجہ محمد نصیر صاحب مرحوم کے سامنے یہ (ناصر احمد) بھی نغمہ سرائی اور بین نوازی انہیں تاریخوں میں کرتے رہے اور بعد ان کی وفات کے حضرت سراسر افادات جانشین شاہ محمد نصیر غفراللہ لہ شرف خلف یادگار سلف مولانا و بالفضل اولانا مولوی یوسف علی صاحب کے سامنے جو لائق سجادہ نشینی خاندان موصوف بل اس امر کے واسطے الیق ہیں وہ بھی مجلس اس کامل کے وجہ سے مزین ہوتی ہے" [2]

ناصر نذیر فراق نے میخانۂ درد میں ایک نئی بات لکھی ہے،

"مومن خاں صاحب کو خواجہ ناصر امیر صاحب کی سجادہ نشینی بہت ناگوار ہوئی کیونکہ ان کا جی چاہتا تھا کہ سسرہ کی جگہ میں سجادہ نشین ہوں مگر جانتے تھے کہ اگر شاعری اور طبابت چھوڑ کر فقیر بنوں گا تو زمانہ چٹکیوں میں اڑائے گا اور کہے گا ۔

اللہ ری گمرہی بت و بت خانہ چھوڑ کر	مومن چلا ہے کعبے کو اک پارسا کے ساتھ

---

۱ - تذکرۂ اہلِ دہلی صفحہ ۲۹، ۲ تذکرۂ اہلِ دہلی صفحہ ۱۷۶

اس لئے انھوں نے یہ ڈھونگ کھڑا کیا کہ اپنے ہم زلف مولوی سید یوسف علی مدراسی کو جمعہ کے دن دلی کی جامع مسجد میں لے گئے اور نماز کے بعد ان کے گلے میں کفنی ڈالی اور ایک ناصری[۱] ان کے کندھے پر رکھی جو میر درد کے خاندان کی خاص علامت تھی اور لوگوں سے کہا خواجہ محمد نصیر صاحب مرحوم کی جگہ آپ ان کے جانشین ہوئے ہیں، مگر مولوی یوسف علی کی طرف دلی والے اصلا متوجہ نہ ہوئے، جب مومن خاں صاحب نے دیکھا کہ یہ افسوں بھی نہ چلا تو انھوں نے بیوی اور سالی کی طرف سے دعویٰ دائر کیا کہ ساری جائداد بارہ دری کی اور اس کے متعلق خواجہ محمد نصیر کی ہے اس لئے ہمیں ملنی چاہیئے۔ اور مقدمہ کی پیروی کے لئے میر تفضیل حسین وکیل کو مقرر کیا، میری پرنانی اور نانی رانڈوں کا اس وقت سوا خدا کے کوئی مددگار نہ تھا، خواجہ ناصر امیر اسوقت ناتجربہ کار اور اپنی ضروریات میں مبتلا تھے، بی اماں بیگم صاحبہ اور عمدہ بیگم صاحبہ نے جوابدہی کیلئے مغل جان وکیل کو ٹہیرایا، پیروی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بارہ دری اور حجرہ یعنے خواجہ میر درد کا عبادت خانہ وقف ہو کر ان کے دعویٰ سے مستثنیٰ ہو گیا اور باقی جائداد کا دعویٰ اس بنا پر خارج ہوا کہ تمام جائداد محمد نصیر کی نہیں ہے، بلکہ خواجہ درد صاحب کی متروکہ ہے چونکہ میر درد صاحب کے خواجہ محمد نصیر صاحب نواسے ہیں اس لئے ان کا چوتھائی حق نانا کے ترکے میں سے ہو سکتا ہے، اس پہلی نالش کے مصارف میں مومن خاں صاحب کی بیوی اور سالی کے سکنی مکان فروخت ہو گئے۔

اب انھوں نے دوبارہ چوتھائی کی نالش کی اس دعویٰ میں انھیں کامیابی ہوئی اور

---

[۱] ناصری ایک لکڑی کا عصا ہوتا تھا جیسا کہ مشائخین اور فقرا عام طور پر رکھتے ہیں اسی کو فقرا بغلی تکیہ بھی کہتے ہیں، چونکہ اس کی وضع خاص ہوتی تھی اور لفظ ناصر اس سے نمایاں ہوتا تھا اس لئے ناصری نام رکھا گیا تھا۔

میری نانی امانی بیگم صاحبہ (خواجہ نصیر کی بہو) اور عمدہ بیگم صاحبہ (خواجہ نصیر کی پوتی ناصر نذیر فراق کی والدہ) میری نانی کی جو ہزاروں روپیہ کی جائداد تھی اس میں سے چوتھائی انجمن النساء (بیگم مومن) اور اشرف النساء (بیگم یوسف علی) کو مل گئی اور خرچہ کی زیر باری میں یہ دونوں مکان جو اب میرے پاس ہیں اور میں نے برخوردار ناصر خلیق کو ہبہ کر دیئے ہیں، اور برخوردار ناصر خلیق ان پر قابض ہیں اور وہ ایک مکان جو ان سے ملحق ہے اور میرے بھتیجوں کے حصے میں ہے نیلام ہو گئے مگر میری والدہ نے اپنا زیور فروخت کر کے ان مکانات کو خرید لیا تھا۔

جب مومن خاں صاحب نے دہلی میں اینٹ سے اینٹ بجائی تو انہوں نے پورب کی طرف توجہ فرمائی مولوی یوسف علی کو ناصری گنج بھیجا تا کہ میر عبدالناصر پر نالش کر کے اپنی چوتھائی لے لیں مگر میر عبدالناصر نے بائیس کے بائیس گاؤں اپنی منکوحہ کے نام مہر میں لکھ دیئے تھے اس لئے مولوی یوسف علی کا پورب جانا بے سود ہوا اور وہاں ان کی دال نہ گلی۔[۲]

ناصر نذیر فراق نے مومن پر جو الزام لگایا ہے وہ محض بہتان ہے مومن جیسا شخص پیری مریدی اور سجادہ نشینی کے کاروبار میں دخل دے ہی نہیں سکتا تھا، البتہ یہ ممکن ہے کہ مومن نے اپنے ہم زلف مولوی یوسف علی کو خواجہ نصیر کا سجادہ نشین بنا دیا ہو، مگر دہلی والوں کا ان کی سجادہ نشینی کو نہ ماننا جو ناصر نذیر فراق نے ظاہر کیا ہے، یہ بھی غلط ہے کیونکہ سرسید خود ان کی جانشینی کے قائل اور گواہ ہیں اور دو جگہ انہوں نے اعتراف کیا ہے اور مولوی یوسف علی کے

۱۔ خواجہ میر درد کی ایک بیٹی براتی بیگم مولوی عبدالحیٔ ابن خواجہ احمد یار خاں سے بیاہی گئی تھیں جن کی جائیداد ناصری گنج آرہ میں تھی اس سے کوئی تعلق خواجہ نصیر کو نہ تھا اس لئے اس کا حصہ انہیں نہ مل سکا،

۲۔ میخانۂ درد صہ ۲۰۵ تا ۲۰۷ -

زہد و اتقا کے معترف ہیں ایسی صورت میں ناصر نذیر فراق کی دروغ بیانی ظاہر ہے لطف خاص یہ ہے کہ خود فراق کے والد میر محسن علی زیدی واسطی مومن کے شاگرد تھے جس کا اعتراف ناصر نذیر فراق نے یوں کیا ہے'

"میر محسن علی زیدی واسطی فارسی شعر و سخن میں اپنے والد کے شاگرد تھے اور اردو شاعری میں مومن خاں صاحب سے برسوں اصلاح لی خواجہ میر درد کی رعایت سے اپنا تخلص ملال کرتے تھے اور فارسی دیوان مرتب کر لیے تھے جو غدر میں تلف ہو گئے غدر کے بعد شعر کہنا چھوڑ دیا تھا یکم رجب ۱۳۳۰ھ کو رحلت کی"[1]

ناصر نذیر فراق نے اپنی تاریخ ولادت ۱۶ اگست ۱۸۶۵ء لکھی ہے اور مومن نے ۱۸۵۲ء میں انتقال کیا ہے یہ مقدمہ بازی ہوئی ہے ۱۲۶۱ھ میں گویا فراق کی ولادت سے انیس بیس سال پہلے کے قصے ہیں فراق نے معلوم نہیں کیا سنا اور کیا سمجھا کہ بات کا بتنگڑ بنا دیا' ان کی تحریر کا ڈھب ظاہر کر رہا ہے کہ وہ مومن سے خفا تھے اس لیے جلے پھپولے پھوڑے ہیں' چنانچہ عرش گیاوی نے حیات مومن کے لیے مواد مانگا تو انہوں نے کچھ بھی نہیں دیا البتہ مومن کی قبر انھیں ضرور بتا دی' یہ بھی غنیمت ہے'

ناصر امیر کے فرزند ناصر وزیر تھے جن کے پوتے ناصر جلیل میرے قدیم عنایت فرما تھے انہوں نے مومن کی کوئی شکایت کبھی نہیں کی بلکہ انہوں نے اپنی لڑکی مومن کے لڑکے سے بیاہی تھی' مومن کا شجرہ ناصر وزیر کا مرتبہ مجھے ناصر جلیل ہی سے ملا تھا' میں نے اس مسودے کی ترتیب شروع کی اور ناصر جلیل سے ذکر کیا تو وہ بے انتہا خوش ہوئے اور کسی محسن بھائی سے مومن کے قصے نقل کر کے لا دینے کا وعدہ بھی کیا مگر اوائل ۱۹۶۰ء میں وہ خود مومن سے جا ملے ان کے فرزند ناصر محمود گلبرگہ میں ہیں مگر وہ خالص دکن کی پیداوار اور "نہ مرشد" قسم کے آدمی ہیں ان سے

[1] میخانۂ درد صد ۲۳۵'

کوئی مواد نہیں مل سکا،

تلمذ و اتباع

مومن نے ابتداً شاہ نصیر کو اپنی چند غزلیں دکھائیں مگر چند ہی روز کے بعد یہ سلسلہ ختم کر دیا اور اپنے طور پر مشق کرنے لگے، چونکہ ان دنوں ناسخ کا شہرہ تھا، اور ان کا دیوان بھی دلی پہنچ گیا تھا، اس لئے مومن نے بھی غالب کی طرح ناسخ کی تتبع شروع کی مگر چند روز کے بعد ہی اس اتباع سے بھی جی بھر گیا اور میر تقی میر کی تتبع کرنے لگے چنانچہ عرصے تک میر کی تتبع کرتے رہے بالآخر اپنا ایک الگ رنگ بنا لیا اور اسی پر مستقل رہے،

میر اور مومن کا تقابلی مطالعہ کیا جائے، تو نہ صرف میر کی غزلوں پر مومن کی غزلیں ملیں گی بلکہ میر کے انداز بھی مومن میں خاصے نظر آئیں گے، سرسری نظر میں چند غزلوں کے مطلعے اور مقطعے نقل کرتا ہوں،

مومن	میر
اس وسعت کلام سے جی تنگ آگیا ناصح تو میری جان نہ کھا دل گیا گیا بوسہ صنم کی آنکھ کا لیتے ہی جان دی مومن کو یاد کیا حجر الاسود آگیا	یہ رنگی بھی ہوتی ہے جی ہی جلا گیا کل حال میر دیکھ کے غش مجھ کو آگیا کیا پوچھتے ہو داغ کیا مرگ میر نے مرکر وہ سینہ سوختہ چھاتی جلا گیا
آگ اشک گرم کو لگے جی کیا ہی جل گیا آنسو جو اس نے پونچھے شب اور ہاتھ جل گیا بتخانے سے نہ کعبہ کی تکلیف دے مجھے مومن خطا معاف کہ یاں جی بہل گیا	شاید جگر حرارتِ عشقی سے جل گیا کیا دردِ دل کہا سو مرا منہ ابل گیا سر اب لگا جھکانے بہت خاک کی طرف شاید کہ میر جی کا دماغی خلل گیا

مومن

تھی وصل میں بھی فکرِ جدائی تمام شب
وہ آئے بھی تو نیند نہ آئی تمام شب
مومن میں اپنے نالوں کے صدقے کہ کہتے ہیں
اس کو بھی آج نیند نہ آئی تمام شب

قتلِ عدو میں عذرِ نزاکت گراں ہے اب
مجھ میں ستم اٹھانے کی طاقت کہاں ہے اب
وہ دن گئے کہ لافِ رگِ ذات جہاد تھا
مومن ہلاکِ خنجرِ نازِ بتاں ہے اب

تم بھی رہنے لگے خفا صاحب
کہیں سایہ مرا پڑا صاحب
نامِ عشقِ بتاں نہ لو مومن
کیجیے بس خدا خدا صاحب

سودا تھا بلا کا جوش پر رات
بستر پہ بچھائے نیشتر رات
اِس گھر میں ہے عیشِ خلد مومن
کیا جانے کہاں ہے دن کدھر رات

میر

اندوہ سے ہوئی نہ رہائی تمام شب
مجھ دل زدہ کو نیند نہ آئی تمام شب
تارے سے میری پلکوں پہ قطرے سرشک کے
دیتے رہے ہیں میر دکھائی تمام شب

وہ جو کشش تھی اسکی طرف ہے کہاں اب
تیر و کماں ہے ہاتھ میں سینہ نشاں ہے اب
برسوں ہوئے گئے اسے پر بھولتا نہیں
یادش بخیر میر رہے خوش جہاں ہے اب

جو کہو تم سو ہے بجا صاحب
ہم برے ہی سہی بھلا صاحب
کِس نے سُن شعر میر یہ نہ کہا
کہیو پھر ہائے کیا کہا صاحب

پلکوں پہ تھے پارۂ جگر رات
ہم آنکھوں میں لے گئے بسر رات
پھر زلفوں میں منہ چھپا کے پوچھا
اب ہووے گی میر کس قدر رات

مومن

ہے سبز پوشش پھر بھی ہیں آنسو رواں ہنوز
جی سرد ہو گیا ہے رہے دل تپاں ہنوز
مومن تو مدتوں سے ہوئے پر یقول زرد
دل سے نہیں گیا ہے خیال بتاں ہنوز

میر

ہے زیر خاک لاشہ عاشق تپاں ہنوز
پیدا ہے عشق کشتے کا اس کے نشاں ہنوز
لخت جگر کہ غم میں کہ تھا لعل پارہ میر
رخسار زرد پر ہے مرے خوں رواں ہنوز

مومن

مجلس میں تا نہ دیکھ سکوں یار کی طرف
دیکھے ہے مجھ کو دیکھ کے تلوار کی طرف
کافر گلے لگا ہے تو مومن کے مت مگر
دیکھا ہے نقش رشتۂ زنار کی طرف

میر

کیا نیچی آنکھیں دیکھو ہو تلوار کی طرف
دیکھو کن آنکھوں سے ہی گنہگار کی طرف
کچھ گل صبا کا لاگو نہیں اس چمن میں میر
کرتے ہیں سب ہی اپنی طرفدار دیکھ کر

مومن

صورت دکھائے جو کبھی جا کے خواب میں
بے دید آنکھیں کھول دے جھنجلا کے خواب میں

میر

آیا کمال نقص مرے دل کی تاب میں
جاتا ہے جی چلا ہی مرا اضطراب میں

آخر الذکر زمین میں غالب اور دوسرے معاصرین مومن کی غزلیں بھی ہیں ممکن ہے کہ یہ زمین طرح ہوی ہو، یہ وہ غزلیں ہیں جو مومن نے میر کی غزلوں پر کہی ہیں مگر مومن نے میر کے قوافی کو خواہ مخواہ باندھنے اور میر کے مضامین کا جواب کہنے کی فکر نہیں کی ہے صرف زمین میر سے لی ہے۔ مگر گلکاری اپنے طور پر کی ہے۔ اور بڑے ہی نفیس گل بوٹے کھلائے ہیں، اس طرح میر کی تتبع ضرور کی ہے۔ مگر اپنے آپ کو الگ بھی رکھا ہے۔ اور اپنی انفرادیت کو فنا نہیں ہونے دیا ہے۔

چونکہ ابتدائی عشق تھی اور طبیعت رواں تھی اس لئے مضمون آفرینی کی طرف بھی کچھ دنوں توجہ رہی اور یہ سے

وقت جوشِ بحر گریہ میں جو گرم نالہ تھا　　حلقہ گرداب رشکِ شعلہ جوالہ تھا

قسم کے شعر بھی کہتے رہے، یہ ایک وبا تھی جس کے جراثیم ابتداً ہر شاعر کے خون میں پرورش پاتے رہے چنانچہ میر، سودا، درد، ناسخ، آتش، مومن، غالب، سب اس میں مبتلا ہوئے ہیں، چنانچہ غالب نے بھی ؎

شب کہ برق سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا　　شعلۂ جوالہ ہر یک حلقۂ گرداب تھا

کہا ہے تقریباً ان دونوں کے شعر ایک ہی قسم کے اور ہم مضمون بھی ہیں، آخر آخر میں غالب نے اس رنگ کو چھوڑ دیا تھا مگر مومن ان سے پہلے اس مرض سے شفایاب ہو چکے تھے، مگر پھر بھی کبھی کبھی اس قسم کا دورہ پڑ جاتا تھا، غزل کہنی شروع کی تو مطلع کہا ؎

شب خدا جانے کہاں وہ ستم ایجاد رہا　　میرے کوچے میں عدو مضطر و ناشاد رہا

مگر اس کے بعد ہی اس مرض صعب کا حملہ ہوتا ہے اور مومن کہنے لگتے ہیں ۔

خون فرہاد سر گردن فرہاد رہا　　نقد جاں تھا ہزائے دیت عاشق حیف

غرض مدتوں اس مرض نے مومن کو مبتلا رکھا ہے، اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ناسخ کا رنگ بھی چند روز تک چڑھا رہا مگر یہ سب ابتدائے مشق اور عنفوانِ شعر و شباب کی باتیں تھیں جیسے جیسے عمر اور مشق بڑھتی گئی یہ سب باتیں چھوٹ گئیں اور مومن نے اپنا ایک رنگ مخصوص کر لیا، اس رنگ کو ہم دوسری جگہ اندازِ مومن کے عنوان سے پیش کر رہے ہیں،

مومن کی انا

مومن میں بعض خوبیاں غیر معمولی تھیں، خودداری اور انانیت میں تو وہ ضرب المثل تھے چنانچہ بیشتر تذکرہ نویس ان کی اس انا کو سمجھنے سے قاصر رہے اور انھوں نے اسے ان کی برائی کے طور پر پیش کیا ہے چنانچہ سعادت خاں ناصر لکھنوی جو ناسخ کے شاگرد تھے اپنے تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا (۱۲۶۱ھ) میں لکھتے ہیں،

"مسیحا نفس، معجز بیان حکیم بے نظیر شاعر بے بدل مومن خاں تخلص مومن

شاہ جہاں آباد کا ساکن، شاعر با جماعت، تلامیذ بے نہایت، غرور شاعری سے از حد، معاصرین سے کاوش، ولد شاہ نصیر سے تحصیل علم اب الکار، یہ اشعار اس سے یادگار"

خواجہ حالی نے یادگار غالب میں بھی دبی زبان سے ان کی انانیت کی طرف اشارہ کیا ہے اور آزاد نے تو صاف صاف الفاظ میں لکھ دیا ہے غرض دوست دشمن سبھی مومن کی انانیت کے شاکی ہیں اس کی وجہ معاشرے کی خرابی ہے، شعراء اور خصوصاً اردو شعراء ہمیشہ بھیک ہی مانگا کیے، میر، درد جیسے چند شعراء کو چھوڑ کر بقیہ سب دریوزہ گری کرتے رہے، مومن کے معاصرین غالب اور ذوق تو اس میں بری طرح مبتلا تھے بقول نیاز فتحپوری

"ذوق کو ظفر کے استاد ہونے کا فخر حاصل تھا اور وہ بالکل خلاف ضمیر ظفر کو "شہنشاہ عالم عالمیان" کہہ کہہ کر اس مفلس وبیدست وپا بادشاہ کو لوٹنا چاہتا تھا، غالب بھی حسرت اپنے ساتھ لے گئے کہ وہ کیوں نہ ذوق کی جگہ ہوئے اور ہر چند انہوں نے اپنی خلش چھپانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے غالب کا یہ کہنا کہ

استاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال | یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

ایک ایسی تعریض اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے کہ اس سے زیادہ اظہار رشک کی شدید مثال مشکل سے کوئی اور مل سکتی ہے[1]"

صہبائی نے گلستان سخن خود مرتب کیا تھا، وہ مومن سے بڑی اچھی طرح واقف تھے اس لئے انہوں نے مومن کی انا کی حقیقت بڑی عمدگی سے واضح کی ہے۔

"سخن سنجان عصر ہر چند بالا دوئی فکر سے سرکش ناز تھے لیکن جو کہ یہ والا نگاہ اپنی ہمت عالی کے اوج سے سب کے احوال پہ نگاہ کرتا تھا ہر سربلند اسکو پست اور

---

[1] مجلہ نگار مومن نمبر جنوری ۱۹۲۸ء ص ۲،

ہر بزرگ اس کو خرد نظر آتا اور وہ بے تصنّع اس کا نام اپنی پندار کے موافق زبان پر لاتا اور ہر چند مساحان اقلیم کمال منازل دور و دراز طے کر کے نشیب و فراز سے واقف اور رہ و بیراہہ سخن سے آگاہ تھے لیکن بکہ یہ چابک خرام کمال پیش بینی سے مراحل بے شمار باقی پاتا تھا ان کو کاہل قدم اور شکستہ پا جان کر بے اختیار ریش خند کرتا اور ان تیز قدموں کو نفس پلے نارساتر بناتا جو کوتاہ بینان روزگار اس والاپائگی اور علو ہمت سے آگاہ نہ تھے اس کی نگاہ کو عیب بیں اور اس کی زبان کو خردہ گیر تصور کر کے زبانِ سرزنش دراز اور طومار شکوہ دراز کرتے .... ہر چند زبان اردو میں تو علم یکتائی بلندی تھا لیکن کمال مہارت سے فارسی کو س لمن الملک کی صدا نے ہند سے فارس تک پہنچ کر طوطیٔ ہند و بلبل شیراز کو دم بخود کر دیا ......"[1]

مومن کی آمدنی ان کی خوش گذرانی کے لئے کافی تھی انھیں کسی کی مدح کر کے صلہ لینے کی ضرورت تھی اور نہ کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرنے کی' نہ شاہ ظفر ان کے اَن داتا تھے نہ رزیڈنٹ ان کا ناخع ' اس لئے ان کا سر کسی کے آگے جھکتا نہ تھا۔

راجہ کپورتھلہ نے تین سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر کر کے بلوایا اور ایک ہزار روپے سفر خرچ بھی بھجوایا مگر جب مومن کو یہ معلوم ہوا کہ وہاں ایک گویئے کو بھی اتنی ہی تنخواہ دیجاتی ہے تو انہوں نے سفر خرچ واپس بھجواتے ہوئے وہاں جانے سے انکار کر دیا[2]

وزیر الدولہ نے ٹونک میں بلا کر رکھنا چاہا تو راضی نہ ہوئے انہوں نے بیشتر لوگوں کو سید احمد بریلوی کے ساتھ حج کو بھیجا اور اُن کے ساتھ مومن کو بھی بھجوانا چاہا تو انکار کر دیا اگر وہ چاہتے تو اپنے دوست حامد علی خاں یا اپنے چچا زاد بھائی حکیم احسن اللہ خاں کی

---

[1] تذکرہ گلستان سخن ص ۴۳۳' [2] آب حیات ص ۳۹۰

وزارت کے زمانے میں دربار شاہی میں بڑی عمدگی سے تقرب حاصل کر سکتے تھے مگر انہوں نے کبھی ایسا خیال تک نہیں کیا، محمد سعید خاں والیٔ رامپور ان کے بے تکلف دوست تھے، اور یوسف علی خاں بھی مخلص شاگرد تھے اگر مومنؔ چشم و ابرو سے ذرا اشارہ بھی کر دیتے تو یہ لوگ یا تو رامپور بلا لیتے یا کوئی معقول وظیفہ مقرر کر دیتے مگر مومنؔ نے یہ گوارا نہ کیا،

ظہیرؔ دہلوی مومنؔ کے بیسیوں قصے حیدرآباد میں سنایا کرتے تھے چنانچہ بادشاہ وقت سے مقابلہ کرنے اور باوجود مطالبے کے قصیدہ نہ کہنے کی تفصیل انہوں نے والد ماجد اور استاد تیرؔ کی کو سنائی تھی جن سے میں نے بھی سنی ہے، مگر اب یہ تفصیل تو یاد نہیں رہی صرف یہ یاد رہ گیا ہے کہ مومنؔ نے باوجود بادشاہ کے مطالبے کے قصیدہ گذرانی سے انکار کر دیا تھا اب جو دیوان مومنؔ میں یہ رباعیاں اور قطعہ نظر آیا تو وہ قصے بھی یاد آ گئے ؎

بدمست ہوں خم کا خم پیا ہے میں نے — جب شہ سے مقابلہ کیا ہے میں نے
مرتا نہیں جور محتسب سے زنہار — کیا آبِ حیات پی لیا ہے میں نے

من شاعرم و تو صدر شاہنشاہی — بر بخل و کرم و ہجو مدح آگاہی
من ہیچ نگفتہ ام تو خود گو آخر — از آصف و ہاماں چہ لقب می خواہی

بادشاہا! بایں متاع قلیل — مدح از چوں منی چرا خواہی
بے بہائی متاعی از مومنؔ — گوہر و لعل بے بہا خواہی
صلۂ شعر نیست تشریفے — کہ نیرزد بہر کجا خواہی
بے ثنا چوں گرفتہ ام صد بار — ہجو گویم اگر ثنا خواہی
دیگراں دیگر اند و من دیگر — ہر چہ از بوم و از ہما خواہی
شاعرانی کہ بے خبر یا لی — کہ خبر ہم بہ مبتدا خواہی

لفظ دلخواہ ہم نمی بینم | چہ معانی چہ مدعا خواہی
در پست نقط نا سزا گویند | گر جزا حرف شرط را خواہی
قدرے پیش ازیں توانم داد | بے[1]... نیر گر زما خواہی
گر مدیح مون آرزو داری | باید اول زر از خدا خواہی

نظام شاہ لبیب تیموری دلی کے قصے اور قلعہ کے مشاعروں کے حالات سناتے ہوئے یہ بھی سناتے تھے کہ لال قلعہ کے مشاعروں میں منتخب شعرا شریک رہتے تھے بادشاہ خود اس مشاعرے کی صدارت کرتے تھے اور حاضرین بڑے ہی ادب قاعدے سے غزل سنایا کرتے تھے، جب کسی شعر کو بادشاہ پسند کرتے تو چشم ابرو سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کر دیتے اور خواص یا نقیب پکار کر تا کہ ظل سبحانی نے اس شعر کو پسند فرمایا ہے، جس کے شعر کو پسند کیا جاتا وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو جاتا اور تسلیمات بجا لاتا بعض اساتذہ کے اشعار پر بادشاہ خود ہی پکار کر واہ کر دیتے اور پھر شاعر اسی طرح آداب تسلیمات بجا لاتا چنانچہ اسی قسم کے ایک مشاعرے میں مومن نے بھی شرکت کی جب غزل سنائی تو بادشاہ نے بے ساختہ داد دی مگر مومن نے نہ تو اٹھ کر کھڑا ہونے کی زحمت کی اور نہ آداب و تسلیمات بجا لانے کی تکلیف کی بلکہ بیٹھے بیٹھے گردن کو ذرا خم دیکر سر جھکا دیا جیسا کہ ان کی عادت تھی چنانچہ اس کے بعد سے مومن کو قلعہ کے مشاعروں میں مدعو نہیں کیا جاتا تھا۔

لبیب بیان کرتے تھے کہ کسی مشاعرے میں بادشاہ کو مخاطب کر کے مومن نے یہ شعر بھی سنایا تھا ؎

پہنچے وہ لوگ رتبہ کو کہ مجھے | شکوۂ بخت نارسا نہ رہا

---

[1] یہ حروف دیوان میں کٹے گئے ہیں۔

چونکہ یہ چوٹ استاد ذوق پر سمجھی گئی اس لئے بادشاہ مومن سے خفا ہو گئے، مگر باوجود اس کے بیشتر شہزادے اور سلاطین زادے مومن کے پاس آتے تھے اور ان کے شاگرد تھے'

سر راس مسعود (مسعود جنگ) نے ایک دفعہ اساتذہ کے غزل پڑھنے کے طریقے بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ انہوں نے مومن کے متعلق بزرگوں سے سنا تھا کہ مومن نیم ترنم سے شعر سنایا کرتے تھے اور شعر پڑھتے پڑھتے از خود رفتہ ہو جاتے کوئی داد دیتا تو مسکرا کر اس کی طرف ایک مربیانہ انداز سے دیکھ لیتے، اگر آزردہ مملوک علی فضل حق غالب یا صہبائی قسم کے لوگ داد دیتے تو مسکرا کر گردن کو خم کر کے سر جھکا دیتے اور پھر شعر سنانے لگتے'

مفتی صدرالدین خاں آزردہ کو قلعہ سے چار پانچ روپے تنخواہ ماہوار ملتی تھی یہ حقیر ماہوار انھیں اتنی عزیز تھی کہ خواجہ محبوب علی نے بند کر دی تو انہوں نے قلعہ میں پہنچ کر واویلا کیا، اور سارا قلعہ سر پر اٹھالیا، اور تنخواہ کی اجرائی کا حکم بادشاہ سے لیکر ٹلے، ان کا یہ حال تھا کہ مشاعرے میں بادشاہ ان کے شعر پر داد دیتے تو یہ کھڑے ہو کر بیسیوں آداب تسلیمات بجالاتے تھے 'ان کے مقابلہ میں مومن کا یہ طرزِ عمل قابلِ غور ہے"

لبیب نے جو شاہی داد کا طریقہ بیان کیا تھا وہ دکن میں بھی جاری رہا ہے چنانچہ اعلیٰ حضرت غفران مکان میر محبوب علی خاں شاہ دکن بہرام الدولہ کی مجلس میں تشریف لاتے اور رشید کا مرثیہ یا رباعی سن کر پسند فرماتے تو محبوب یار جنگ کی طرف خاص نظروں سے دیکھتے اور وہ اُٹھ کر رشید سے کہتے کہ حضور نے اس شعر کو پسند فرمایا ہے۔ یہ سن کر رشید ممبر سے اُتر کر آداب تسلیمات بجالاتے اور پھر ممبر پر جا کر سنانے لگتے'

مومن کی سی غیرت و خودداری کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی، ہندستان تو کیا ایران بھی ایسا کوئی شاعر پیش نہیں کر سکتا البتہ عرب میں متنبی مومن ہی کی طرح غیور، خوددار اور متکبر لیا دیا رہنے والا تھا،

مومن نے صرف دو قصیدے مدح میں کہے ہیں، والئی ٹونک ان کے دوست، پیر بھائی ہم مشرب اور مخلص تھے، ان کی مدح والئی ٹونک کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک بے تکلف اور عزیز دوست سمجھ کر کی ہے۔ اور ایک قصیدہ جو راجہ صاحب پٹیالہ کی مدح میں کہا ہے وہ سراسر اظہار تشکر میں کہا گیا ہے۔ کیونکہ انھوں نے مومن سے ملاقات کے بعد ہتھنی پر بٹھا کر رخصت کیا تھا، اس کے بعد پھر ان کی زبان کسی کی مدح و ثنا سے آلودہ نہیں ہوئی۔

مومن اس مقام پر تھے جہاں سے انھیں اپنے تمام معاصرین بے انتہا پست نظر آتے تھے اور ان کے کردار بہت ہی گھٹیا، اسی لیے وہ کسی کی تخصیص نہیں کرتے بلکہ سب کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

ہیں یہ سگانِ جیفہ خوار عز سخن سے بے نصیب ٭ کافر استخواں پرست طرفہ سگی و کافری

مُردوں کو تجھ پہ دیتے ہیں ترجیح جو حسود ٭ مومن یہ جان لے کہ سگِ جیفہ خوار ہیں

مومن یہ شاعروں کا مرے آگے رنگ ہے ٭ جوں پیش آفتاب ہو بے نور تر چراغ

مومن کی یہ انا اس لئے تھی کہ ان کی پرورش ہی ایسے گھرانے میں ہوئی تھی جو بلند کردار بلند اخلاق اور شریفانہ وضع داری کا نمونہ تھا، چنانچہ ایک رقعہ میں انھوں نے لکھا ہے

"نمی دانستم کہ اشراف و اکابر بد معاش و بے ایمانند بدولت ارشاد خدمت سامی آگاہ گشتم، اے کاش اول کہ چشم می کشادم بہ رزائل و سفلگان ہمچوں قبائل و السکان پیوستم از ان باز بہ غلام زادگان، مطربان ہمدم می شدم، بعد ازاں ہر کہ از ناکساں می دیدم صحبتش نعمت غیر مترقب می فہمیدم، حیف کہ وقت از دست رفت و عمرم بصحبت اشراف و اراکین ضائع گشت

اگر رہنمائی کہ دریں باب تازہ شدہ است بطول انجامد وچنیں صحبت کس میاب باہری خدمت کرام میسرم آید زیادہ تر شکر گزار وسپاسدار خواہم بود.... ....الحمد للہ کہ در قبائل خود مختارم نہ سرفرازﷺ"

سماجی زندگی

مومن کے جس قدر حالات معلوم ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کوئی رعونت مآب حکیم یا کم آمیز شاعر نہ تھے بلکہ سماجی آدمی تھے چنانچہ ان کے مراسم ہر فرقے اور ہر طبقہ سے تھے اور وہ مرنجاں ومرنج زندگی بسر کرتے تھے۔

ایک رقعہ میں حکیم احسن اللہ خاں کو کسی لالہ جوالا پرشاد سے متعلق لکھا ہے کہ "از بدو فطرت در زمان طفلی یار بودم"[1] حکیم غلام حسین خاں کو ایک رقعہ میں لکھا ہے کہ "چندیت کہ آشنا زادہ ام لالہ شیام لال در رسالۂ نواب مشیر الملک بسفارت می گزراند غالباً ملازمت والا حضرت اعلیٰ بہرہ یاب باشد بنا بر علیہ خامۂ گستاخ نیاز شوخی تحریر سفارش کند و چشم آں دارم کہ ہر کارے کہ دارد، بہر التجا کہ آرد حاجت روائی و لطف فرمائی بکار در آید"[3]

فارسی دیوان میں ہرکشن داس کی شادی اور خوش وقت رائے کے بنائے میخانہ کی تاریخوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو طبقے خصوصاً کائستھ فرقے سے بڑے اچھے مراسم تھے حکیم سکھانند رقم اور راجو دھیا پرشاد صبر کی شاگردی اور حاضر باشی سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے۔

دلی کے شیعہ طبقے سے بھی مومن کے تعلقات برادرانہ اور دوستانہ تھے چنانچہ امام باڑوں اور ضریحوں کی تاریخیں اس کی گواہ ہیں باوجود اہل حدیث اور غیر مقلد کہلانے کے پیر پرستوں

---

[1] انشائے مومن ص ۱۶۲، ۱۶۳، [2] انشائے مومن ص ۱۲۰، رقعہ ۳۶
[3] انشائے مومن ص ۱۲۵، رقعہ ۴۱

اور پیروں سے بھی دوستی محبت تھی چنانچہ میاں کالے کی وفات کی تاریخ "کالے صاحب کو سُرخ رو پایا" سے نکالی ہے۔

مومن کی طبابت ہی ان کی عوام دوستی کی مظہر نہیں بلکہ نجوم رمل، تعویذ نویسی اور شاعری بھی اُن کے سماجی اقدار کا آئینہ ہے اور شاگردوں کی کثرت اور احباب کی فراوانی بھی گواہ ہے کہ وہ اچھے سماجی تھے۔

دلی کے تین فارسی داں

۱۸۴۰ء میں جب دہلی کالج نئے اصول پر قائم ہوا تو مسٹر ٹامسن سکریٹری گورنمنٹ ہند نے جو آخر میں اضلاع شمال و مغرب میں لفٹنٹ گورنر ہو گئے تھے مدرسین کے امتحان کے لئے دہلی پہونچے اور چاہا کہ جس طرح کا ایک سو روپے ماہوار تنخواہ کا عربی کے لئے مدرس مقرر ہوا ہے اسی طرح فارسی کے لئے بھی مقرر کیا جائے۔[1]

چنانچہ ٹامسن نے مفتی صدرالدین خاں سے شورہ کیا تو انہوں نے کہا "اس شہر میں اچھے فارسی داں تین شخص منتخب روزگار ہیں ایک مرزا نوشہ صاحب دوسرے مولوی امام بخش صاحب تیسرے مومن خاں"[2]

ٹامسن نے ان تینوں کو بلایا، اس کی تفصیل کریم الدین نے اپنے تذکرہ طبقات الشعرا میں اس طرح لکھی ہے چونکہ کریم الدین ان دنوں دلی میں موجود تھے اس لئے ان کا بیان زیادہ وقیع ہے۔

"مرزا نوشہ نے بسبب اس کے کہ ان کو نوکری سے استغنا تھی انکار کیا، حکیم مومن خاں صاحب نے درخواست ایک سو روپیہ ماہوار کی کی، مولوی امام بخش نے چونکہ کسی طرح کا وسیلہ بجز روزگار کے وجہ معاش نہ رکھتے تھے حسب خواہش گورنر بہادر کے حکم اجابت کے چالیس روپے

---

[1] یادگار غالب صـ ۲۷ [2] طبقات الشعرا صـ ۱۲۴

ماہواران کے واسطے مقرر ہو اور مدرس اول فارسی خوانوں کے مقرر ہوئے ۱۸۴۰ء سے درس وتدریس کرنے لگے"[۱]

آزاد نے لکھا ہے کہ" انہوں (مومن) نے سو روپے سے کم منظور نہ کئے صاحب نے کہا سو روپے لو تو ہمارے ساتھ چلو ان کے دل نے نہ مانا کہ دلی کو ایسا سستا بیچ ڈالیں"[۲]

مومن کے احباب

انسان اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے چنانچہ مومن کی زندگی سے واقف ہونے اور ان کی حالت کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ان کے دوستوں کا جائزہ لینا ضروری ہے اس لئے ہم مومن کے دوستوں کے حالات بھی قلمبند کر رہے ہیں' یہ لوگ مومن کے وہ دوست تھے جن کی صحبت میں وہ اپنے دن بتایا کرتے تھے اور صبح سے شام تک ان ہی دوستوں سے صحبت رہتی اور انھیں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے شعر وشاعری بحث ومباحثہ کرتے اور شطرنج کھیلتے تھے ان کے علاوہ کوئی اور طبقہ مومن کے دوستوں کا نہ تھا' کیونکہ مومن کی زندگی کھلی ہوئی تھی اور وہ ہر کام کھلے بندوں کرتے تھے اوروں کی طرح وہ دن کو فضل حق اور شیفتہ کی صحبت میں رہ کر رات کو "جوا خانہ" نہیں چلاتے تھے ان کی اپنی ذاتی آمدنی ہی ان کی شریفانہ خوش گزرانی کے لئے کافی تھی'

یوں تو دلی کے سارے شرفا اور معززین ہی مومن کے دوست تھے مگر ہم صرف ان لوگوں کو گنا رہے ہیں جو ان کے مخلص دوست بے تکلف ساتھی اور دن رات کے ہم جلیس تھے'

مولوی فضل حق

یہ بیٹے تھے مولوی فضل امام کے جو مشہور عالم اور علوم عقلیہ میں سارے ہندوستان کے

---

۱ طبقات الشعراء ص ۱۹۱ ' ۲ آب حیات ص ۵۲۳

علماء میں ممتاز تھے، مدتوں سرکارِ انگریزی کی طرف سے دہلی کے صدرالصدور رہ کر ۵ ذیقعدہ ۱۲۴۳ھ کو انتقال کیا، میرزاہد اور ملا جلال پر ان کا حاشیہ اور آمدنامہ جو آج تک فارسی کے مبتدیوں کو پڑھایا جاتا ہے مشہور ہے، مولوی فضل حق ۱۲۱۱ھ / ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اپنے والد ہی سے پائی پھر شاہ عبدالقادرؒ کے پاس پڑھنے لگے، چار مہینے میں قرآن حفظ کیا اور تیرہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے۔

مومنؔ عمر میں فضل حق سے صرف چار سال چھوٹے تھے اور چونکہ دونوں ہم مکتب تھے اس لئے آپس میں خلوص پیدا ہو گیا چونکہ دونوں ذہین، طباع اور ذہین تھے اس لئے ایک دوسرے کی قابلیت کے معترف رہے اور دونوں آخر تک محبت اور خلوص کی زندگی بسر کرتے رہے، فضل حق حکمت و منطق، معقولات و ادب، کلام و اصول عروض و قافیہ میں اپنے معاصرین میں ممتاز تھے اسی لئے کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے، چار ہزار سے زیادہ شعر تحویل حافظہ تھے، خود بھی شاعر تھے نہایت ہی پاکیزہ مذاق تھا، فارسی اور عربی میں زیادہ شعر کہتے تھے نقاد بھی بڑے پایہ کے تھے غالبؔ کو حقیقی معنی میں غالب انھوں نے ہی بنایا،

غدر ۱۸۵۷ء میں کچھ اور فضل حق کا محضر اور تحریر انگریزوں کے خلاف پیش ہوئی مقدمہ چلا تو مخبروں نے ان کا پتہ بتا دیا، اور حکومت نے سزا دی کالے پانی بھجوا دیا جہاں ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء کو انتقال کیا، الجنس العالی فی شرح جواہر الغالی، حاشیہ مسلم، حاشیہ افق مبین، رسالہ تحقیق العلم و العلوم، تاریخ ہندوستان ان کی مشہور کتابیں ہیں[۱]، علاوہ آپ جس عمدگی سے پڑھاتے تھے دلی بھر میں کوئی ایسا پڑھا نہ سکتا تھا، مسلم الثبوت فاضل اور ادیب تھے مشہور ہے کہ طوائفین کے پاس بیٹھ کر بھی طلبا کو درس دیتے تھے عربی کے

---

[۱] قاموس المشاہیر جلد ۲ ص ۱۲۷، آثار الصنادید باب ۴ ص ۶۲، ۶۴، ماہ نامہ تحریک دہلی بابتہ ماہ مئی ۱۹۶۰ء مضمون مالک رام،

بے نقط قصائد مشہور ہیں۔[1]

مومن نے اتنا خلوص اور ایسی محبت تھی کہ روزانہ ملتے اور زیادہ سے زیادہ وقت اکٹھا گزارتے تھے، چنانچہ شطرنج ہمیشہ کھیلتے اور مومن سے ہارتے تھے، ایک دفعہ غالب نے پوچھا کہ آپ اس قدر ذہین اور طباع ہیں پھر کیوں مومن خاں سے ہر بار مات کھا جاتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا،

"مومن ایک بھیڑیا ہے اُسے اپنی قوت کی خبر نہیں ہے وہ عشق و عاشقی کے قصوں میں پھنس گیا۔ اگر علمی مشغلے میں پڑتا تو اس وقت اُس کے ذہن کی حقیقت معلوم ہوتی فی الحقیقت نہایت ذہین آدمی ہے۔"[2]

فضل حق باوجود اس علم و فضل کے شاہ دہومن سے بیعت اور غالی سنی تھے، چنانچہ اسی غلو میں بدعت پسند ہو گئے تھے، باوجود ہم درسی اور دوستی کے مولوی اسمٰعیل سے نہ بنتی تھی اور ہمیشہ ان سے بحث و مباحثہ کرتے رہتے تھے، مولوی اسمٰعیل کے خلاف پروپیگنڈا اور ریشہ دوانی بھی کرتے رہتے تھے، چنانچہ لوگوں کو بھڑکا کر مولوی اسمٰعیل کے خلاف ایک محضر بھی رزیڈنٹ کے پاس بھجوا دیا تھا، جب ان کی یہ ساری کوششیں بار آور نہ ہوئیں تو انہوں نے مسئلہ امکان نظیر چھیڑ کر مولوی اسمٰعیل کو الجھا دیا، اس کی حقیقت ابوالکلام آزاد نے یوں لکھی ہے "شاہ اسمٰعیل نے تقویت الایمان میں لکھا ہے کہ اگر خدا چاہے تو ایک پل میں کروڑ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مثال پیدا کر دئے۔ فضل حق نے معقولات کی رنگ آمیزیوں سے ایک تقریر اس کی رد میں لکھی، اور یہ دعوی کیا کہ خاتم النبیین کا پیدا ہونا ممتنع بالذات ہے اور پھر قدرت اور مشیت کا فرق فراموش کر کے سارا معاملہ مشیت کے محل میں لے گئے، ساری تقریر جدل و مکابرا کا ایک لفظی گورکھ دھندا تھی، شاہ اسمٰعیل نماز کے لیے جامع مسجد جاتے تھے

---

[1] حیات طیبہ ص۵۳، [2] امیر الروایات ص۱۶۰، روایت ۱۵۵

راہ میں تقریر بلی نماز کے بعد مسجد ہی میں بیٹھ گئے اور کاغذ قلم منگوا کر ایک پورا رسالہ اس کے جواب میں قلمبند کر دیا چونکہ ایک ہی دن میں یہ لکھا گیا تھا اس لئے "یک روزی" کے نام سے مشہور ہو گیا۔ پھر مولانا صدر الدین نے بھی اس پہ ایک تقریر لکھی اور یہ دونوں رسالے "ایضاح الحق الصریح" کے حاشیہ پر چھپ گئے ہیں۔[1]

یہ بحث مدتوں ہوتی رہی جن دنوں اس کی گرم بازاری تھی ایک روز فضل حق اور مومن بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے کہ فضل حق کی کوئی تحریر شاہ اسمٰعیل کو پہنچا کر ان کا ملازم واپس آیا اور کہنے لگا مولوی صاحب نے فرمایا ہے کہ جواب بھیج دیں گے' چونکہ شاہ اسمٰعیل فضل حق کی تحریر کا جواب فوراً بھجوا دیا کرتے تھے اور یہ پہلا موقع تحریر روک رکھنے کا تھا' اس لئے فضل حق نے اپنی تحریر کا حال بیان کیا اور مومن نے شاہ صاحب کی طرفداری میں بحث شروع کر دی' باقاعدہ مناظرہ ہوا جس میں مومن غالب رہے چونکہ اس بحث میں طبیعت مکدر ہو گئی تھی اِس لئے مومن یہ شعر پڑھتے ہوئے اٹھ گئے ؎

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال دیں — مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

آرزو فضل حق کا تخلص تھا اور مومن فضل حق کو ہمیشہ بدعتی کہا کرتے تھے اس لئے اس شعر میں بھی یہی اشارے ہیں'

دو روز تک مومن اور فضل حق ایک دوسرے سے جدا رہے اور دونوں ایک دوسرے کے لئے بے چین رہے اسی بے چینی میں یہ مطلع کہا ؎

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم — منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

بالآخر تیسرے روز فضل حق مومن کے گھر پر پہنچے اور انھیں منا لیا تو کہا ؎

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم — پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم[2]

---

[1] نقش آزاد ص ۳۰۹' [2] امیر الروایات ص ۱۵۹' ۱۶۰' روایت ۱۵۲

مولانا عبد اللہ عمادی نے ایک دفعہ یہ واقعہ سنایا تھا کہ انھیں مناظرے کے دنوں میں کسی جگہ مومن اور فضل حق بیٹھے ہوئے تھے اور فضل حق شاہ اسمٰعیل کے نظریات ہی کے متعلق گفتگو کر رہے تھے کہ شاہ صاحب لوگوں کو ورغلاتے ہیں وغیرہ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ شاہ اسمٰعیل اس طرف آتے ہوئے نظر آئے انھیں دیکھتے ہی مومن نے فضل حق سے مخاطب ہو کر کہا ؎

اے ناصحو آ ہی گیا وہ فتنۂ ایام لو — ہم کو تو کہتے تھے بھلا اب تم تو دل کو تھام لو

یہ قصے غالباً ۱۲۴۰ھ کے ہیں کیونکہ وہی زمانہ اس بحث و مباحثہ کا تھا مگر یہ دوستی اور محبت بھی قابلِ رشک ہے کہ باوجود اتنے شدید اختلاف کے دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست اور ایک دوسرے کی قابلیت کے معترف تھے اور مومن کے انتقال تک دونوں کا خلوص باقی رہا، مفتی صدر الدین آزردہ

مولوی لطف اللہ کشمیری کے فرزند تھے ۱۲۰۴ھ میں دہلی ہی میں پیدا ہوئے، شاہ عبد العزیز اور مولوی فضل امام خیرآبادی کے شاگرد اور جید عالم تھے، غدر سے پہلے دہلی کے صدر الصدور تھے، عربی اردو اور فارسی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، ابتداً اردو کلام شاہ نصیر کو پھر مجرم اکبرآبادی کو دکھاتے رہے آخر میں میر ممنون کے شاگرد ہو گئے تھے، احباب نواز اور مرنجاں و مرنج، نفاست پسند، زندہ دل اور وضع دار بزرگ تھے نواب یوسف علی خاں والیٔ رامپور، نواب صدیق حسن خاں (بھوپال) اور سر سید جیسے لوگ آپ کے شاگرد تھے؛

غدر ۱۸۵۷ء میں مفسدوں نے جہاد کا فتویٰ پیش کر کے جبراً آپ کے دستخط لئے تھے اسی الزام میں آپ کی جائداد ضبط ہوئی اور عہدے سے برطرف کر دیئے گئے پھر قید بھی رہے، بالآخر قید سے چھوٹے تو آدھی جائداد واگذاشت ہوئی، اسی پر قانع رہے، نواب یوسف علی خاں والیٔ رامپور نے آپ کے مدرسہ کے لئے دو سو روپیہ وظیفہ مقرر

کردیا تھا، مرنے تک مدرسہ دارالبقا قائم رکھا،

مومن کے محب بے ریا تھے، اور ان کی زندگی بھر دوستی محبت رہی باوجود ملازمتی مصروفیتوں کے درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھتے تھے، آپ کا دیوان خانہ اہلِ علم و کمال کا مرجع تھا۔ مومن شیفتہ صہبائی مملوک علی غالب وغیرہ منتخب روزگار ہستیاں جمع ہوتیں علمی ادبی مسائل اور شعری مباحث ہوتے رہتے غالب کی طرح مفتی صاحب بھی لاولد تھے اس لئے اپنی سالی کے بیٹے عنایت الرحمٰن خاں کو گود لیا تھا اور بیٹا بنا کر تعلیم و تربیت کی تھی مفتی صاحب کے انتقال کے بعد عنایت الرحمٰن حیدرآباد آگئے اور یہاں کمشنر انعام مقرر ہوگئے تھے۔ مفتی صاحب نے ایک تذکرہ شعراء بھی مرتب کیا تھا جو لندن میں محفوظ ہے اسکی نقل ڈاکٹر مختارالدین (علیگڈھ) نے حاصل کرلی ہے اور وہ چھپوانے کی فکر میں ہیں۔

مفتی صاحب نے ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ ۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء کو دہلی میں انتقال کیا اور بزم آخران کے بعد اجڑ گئی کیونکہ اسی سال آگے پیچھے غالب، شیفتہ، اور آزردہ نے انتقال کیا چنانچہ کسی نے کہا ہے ؎

در یکے سال زگیتی رفتند | غالب و شیفتہ و گرم و سرور

شیفتہ اور آزردہ کی دوستی عشق و محبت کے درجے کو پہونچ گئی تھی آخر تک دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہے اور ایک ہی سال دونوں نے جنت کی راہ لی مفتی صاحب مومن کی زندگی بھر ان کے معترف و مداح مخلص اور دوست رہے اور روزانہ کی ہم نشینی میں فرق نہ آیا۔

صہبائی

مولوی امام بخش صہبائی دہلی کے شرفا اور علماء سے تھے، خاندان ولی اللہی کے شاگرد اور مستعد عالم تھے، مومن سے بڑا خلوص تھا روزانہ کے ملنے والے تھے مدرسہ عالیہ دہلی کے مدرس فارسی تھے گھر پر بھی طلباء کو درس دیا کرتے تھے اور لوگوں کی تالیف و تصنیف میں بھی امداد کرتے رہتے۔ چنانچہ ایک شاگرد کو تذکرہ گلستان سخن مرتب کردیا، سرسید نے آثارالصنادید ترتیب دی تو

اس کا باب چہارم مرتب کر دیا جو تذکرۂ اہلِ دہلی کے نام سے علیحدہ بھی طبع ہو گیا ہے، حدایق البلاغت کا ترجمہ کیا اور بہت سی تصانیف کیں،

صہبائی، اور مومن میں بڑا ربط و ضبط تھا، اور دونوں ایک دوسرے کے مداح اور معترف تھے، غدر کے ہنگامے میں گوروں نے صہبائی اور ان کے بیٹے کو گولی مار دی ان کی نعش کا پتہ نہ چلا، مفتی صدر الدین خاں نے دہلی کے مرثیہ میں صہبائی کا ماتم بھی کیا ہے ؎

روزِ وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے
سر ہے اور جوشِ جنوں سنگ ہے اور چھاتی ہے

ٹکڑے ہوتا ہے جگر جاں پہ بن جاتی ہے
مصطفیٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے

کیونکر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

صہبائی عربی فارسی خوب کہتے تھے ان کے اردو شعر کہیں نہیں ملتے، یہ شعر معلوم نہیں کس عالم میں کہا تھا کہ ان کے مرنے سے دہلی کی بزم شعر و سخن ہی برہم ہو گئی ؎

مردم و در چشم مردم عالمے تاریک شد
من مگر شمعم چو رفتم بزم برہم ساختم

صہبائی کا یہ شعر ظہیر دہلوی ہمیشہ پڑھا کرتے تھے ؎

دیدم سحر صہبائی آشفتہ ورمیخانہ
شعرے بلب ساغر بکف اوراقِ دیواں در بغل

مملوک علی

دلی کے رہنے والے نہ تھے مگر بچپن سے دہلی ہی میں تھے، عربی کے جید عالم اور خاندان ولی اللہی کے فیض یافتہ تھے، مدرسہ عالیہ دہلی کے مدرس اول تھے، ہزاروں طالب علم آپ سے فیض یاب ہوئے ہیں، نہایت ہی پابند شرع تھے ایک دفعہ رزیڈنٹ مدرسہ کے معائنہ کے لئے آیا تو اس نے آپ کو مصافحہ کی عزت بخشی اور آپ نے مصافحہ کے بعد ہاتھ لٹکائے رکھا جب رزیڈنٹ چلا گیا تو آپ نے تین تین بار ہاتھ دھو کر پاک کیا کیونکہ عیسائی کے چھونے سے ناپاک ہو گیا تھا، غرض بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے، مشاعروں میں کم جاتے تھے اور خود شعر نہ کہتے تھے مگر ذوق سخن فطری تھا اور قوت نقد غیر معمولی تھی، مومن،

آزردہ اور شیفتہ کے ساتھ ہمیشہ رہتے تھے ناقد ایسے تھے کہ اگر کسی کے شعر کی تعریف کر دیتے تو گویا اسے سند مل جاتی تھی۔

مومن کے مخلص دوست تھے اور روزانہ ملنے والوں میں سے تھے' غدر کے بعد بھی زندہ تھے اور تحریکِ ولی اللّٰہی کو آگے بڑھاتے رہے' ہندوستان میں جو مدرسے غدر کے بعد جاری ہوئے وہ آپ ہی کی تحریک کا نتیجہ تھے'

حکیم سکھانند رقم

دلی کے پرانے بزرگ تھے' شاعری میں مومن سے نہیں بلکہ شاہ نصیر سے تلمذ تھا البتہ رمل اور نجوم میں مومن کے شاگرد تھے' بڑے اچھے طبیب اور ماہر نجومی اور رمال تھے' روزانہ مومن کے دربار میں حاضر رہتے نہایت خوش مزاج' خوش پوش خوش فکر خوش وضع خوش خو' خوش باش مردِ ظریف تھے' مومن کے بعد دلی کے واحد نجومی مانے جاتے تھے' غدر کے بعد خانہ نشین ہو گئے تھے' ۱۲۸۵ھ میں انتقال کیا اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے'

حکیم احسن اللّٰہ خاں

حضرت خلیفۂ اول سیدنا صدیق کے خانوادۂ گرامی کے ایک بزرگ خواجہ زین الدین ہراتی بڑے صاحب مقامات تھے' جو ہرات سے کشمیر آگئے تھے' جہاں آپ کا مزار ڈل کے کنارے زیارت گاہ خاص و عام ہے' انھیں کی اولاد سے حکیم محمد عزیز اللّٰہ خاں تھے جو حکیم ذکا اللّٰہ خاں کے شاگرد اور اپنے وقت کے مستند طبیب تھے آپ سے مومن کی پھپی بیاہی گئی تھیں جن کے بطن سے حکیم احسن اللّٰہ خاں وجود میں آئے' جو نہ صرف حکمت و طبابت میں کامل بلکہ ہیئت و ہندسہ' ادب و تاریخ میں بھی ماہر تھے' ابتداً فخر الدولہ احمد بخش خاں کے پاس رہے پھر فیض طلب خاں والیٔ جھجر کے پاس رہے اور ان کے بعد اکبر شاہ ثانی نے طبیب شاہی بنایا عمدۃ الحکماء حاذق الزماں خطاب ملے' شاہ ابوظفر کے بھی طبیب خاص اور مشیر باختصاص تھے'

مومن خاں سے صرف رشتۂ برادری ہی نہ تھا بلکہ رشتۂ الفت و مودت بھی قائم تھا، مومن کی وفات سے پہلے ہی حکیم صاحب نے ان کا کلیات نظم و نثر فارسی مرتب کیا تھا جب وہ کوٹھے سے گرے تو انہوں نے دیوان فارسی اور دیوان اردو کی نظر ثانی میں مصروف کر دیا تا کہ تکلیف کا احساس کم ہوتا جائے۔

چنانچہ مرتے تک مومن اسی میں مصروف رہے جب وہ فارسی دیوان کی نظر ثانی کر چکے تو عبدالرحمٰن آہی نے اردو کلیات پیش کر کے اس کی نظر ثانی بھی کرائی اس طرح مرتے مرتے مومن نے اپنے نتائج افکار پر ایک آخری نظر بھی ڈال لی، مومن کے انتقال کے بعد حکیم صاحب نے مومن کا فارسی دیوان اور انشائے مومن شائع کی ہے'

حکیم احسن اللہ خاں کچھ محسن کش طالع رکھتے تھے' فخر الدولہ اور فیض طلب خاں اور اکبر شاہ ثانی تو طبعی موت مرے مگر ان کے آخری محسن ابو ظفر کی ظاہری موت حکیم صاحب ہی کی ہاتوں ہوئی کیونکہ غدر میں انہوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا' ابوالکلام آزاد نے اس کی تفصیل یوں بیان کی ہے "یہ صحیح نہیں کہ حکیم احسن اللہ خاں کے خلاف بدگمانی بے اصل تھی' عین محاصرۂ دہلی کے دوران میں یہ برابر انگریزی کیمپ سے نامہ و پیام کرتے رہے' خود ہاڈسن اپنے خط میں لکھتا ہے جب مجھے دہلی جانے کا حکم ہوا تو میں نے سر ہنری لارنس کے منظور نظر (فیورٹ) یک چشم رجب علی کو بہ طور منشی کے اپنے ساتھ لیا' اس نے دہلی کے سامنے پہنچتے ہی نامہ و پیام شروع کر دیا۔ چنانچہ قلعہ سے حکیم کے خطوط آنے لگے' حکیم احسن اللہ خاں نے انگریزوں سے دو باتوں کا وعدہ کیا تھا' چنانچہ انہوں نے یہ دونوں باتیں پوری کر دکھائیں (بادشاہ کو دہلی سے فوج کے ساتھ نہ جانے دیں گے۔ قلعہ کے دفتر کے کاغذات محفوظ رکھیں گے اور انگریزوں کے حوالے کر دیں گے) ....

حکیم اجمل خاں کہتے تھے کہ (حکیم احسن اللہ خاں) غدر کے بعد جے پور میں ملازم ہو گئے تھے اور گاہ گاہ دہلی آتے تھے مگر لوگوں کی نظروں سے اس درجہ گر چکے تھے کہ انھیں عوام کے

سامنے آنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی بالکل خانہ نشین رہتے تھے"[1]

حکیم احسن اللہ خاں نے ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء میں انتقال کیا کسی نے تاریخ لکھی ہے ؎

احسن اللہ خاں طبیب اجل — جاں بجاں آفریں سپرد افسوس
از دہانِ دل ایں صدا آمد — وائے بقراط وقت مرد افسوس[2]

خواجہ حالی کا بیان ہے کہ حکیم صاحب مرزا غالب کے جنازے کی نماز میں شریک تھے[3]
عالم غربت میں بمقام بڑودہ انتقال ہوا، اور وہیں سپرد خاک ہوئے[4]۔ مرزا فرحت اللہ بیگ
نے ان کا حلیہ لکھا ہے اور فنِ طب اور تاریخ دانی کی تعریف کی ہے[5]۔

حامد علی خاں

دلی کے مشہور امیر اور نواب افضل علی خاں کے داماد تھے مومن کے بے تکلف اور گہرے
دوست تھے ابتداً شاہ ظفر سے مختار ہوئے پھر وزیر بنائے گئے اسی خلوص اور یگانگت کی
وجہ سے مومن نے تاریخ لکھی ؎

اے وزیر بلند پایہ تجھے — التفاتِ شہی مبارک ہو
قدرِ عالی و خصلت محمود — خان حامد علی مبارک ہو
رفعت پایہ روز افزوں باد — آسماں پائگی مبارک ہو
امرائے زمانہ سے ہے تجھے — ہر طرح ہمسری مبارک ہو
فیل گردوں مطیع ہے تیرا — فیل تشریف بھی مبارک ہو
تیری دولت سے سب کو ہے شش و پنج — صد راز دہی مبارک ہو
میری تیغ زباں کی تیزی سے — تجھ کو اعدا کشی مبارک ہو

---

[1] نقش آزاد ص ۲۹۴، ۲۹۹ [2] سرودِ غیبی ص ۲۰، [3] یادگار غالب —
[4] حاشیہ غالب مؤلفہ مہر ص ۲۹۱، [5] ۱۲۶۱ھ میں دلی کا مشاعرہ از مرزا فرحت اللہ بیگ

مومن آیا بزم میں تیری — صحبت آرائی مبارک ہو
بہر تاریخ یوں کہا بے فکر — خلعت آصفی مبارک ہو
۵۵ ۸ ۱۲

دیگر

نواب کو بادشہ نے بخشا — خلعت میں فیل چرخ تمثیل
مومن نے زیادہ بہر تاریخ — تشریف وزیر پہ کیا پیل
۵۵ ۲ ۱۲

محمد سعید خاں

نواب محمد سعید خاں سریر آرائے رام پور ہونے سے پہلے دہلی میں رہتے تھے اسی زمانے میں مومن سے دوستی اور بے تکلفی ہو گئی تھی چنانچہ یہ جب ڈپٹی کلکٹر ہو کر بدایون گئے تو مومن نے انھیں کی خاطر بدایون اور سہسوان کا سفر کیا اور پھر ۱۲۵۶ھ میں یہ سریر آرائے رام پور ہوئے تو اسی سال یا اس کے بعد ہی مومن رام پور بھی گئے ان کی تخت نشینی کی تاریخ بھی مومن نے کہی ہے ؎

رام پور اک زمان ممتد سے — تیرے مقدم کا تھا تمنائی
جب پذیرا ہوئی دعائے دیار — اے سراپا قبول والائی
یعنے اس ملک کے نصیب کھلے — تیرے قدموں پہ کی جبیں سائی
تیرے خدام کو نصیب ہوئی — حکمرانی و کار فرمائی
تجھ کو شائستہ کرسی عزت — تجھ کو زیبا سریر آرائی
میں ہوا گرم فکر سال جلوس — ناگہاں غیب سے ندا آئی
کہ محمد سعید خاں کو ملی — ورثۂ صدر کام آبائی
اس وساوہ پہ تجھ کو بٹھلا کر — میں نے تاریخ کی روش پائی

(محمد سعید خاں = ۸۸۷ میں ورثۂ صدر = ۳۶۹ کا تذکرہ کر کے ۱۲۵۶ھ تاریخ نکالی ہے)

مومن کا دو دفعہ اُن کے پاس (بدایون اور رامپور) جانا اور اس بے تکلفی سے تاریخ کہنا خود ظاہر کرتا ہے کہ دونوں کے مراسم کیسے تھے ورنہ مومن جیسا کم اختلاط کسی معمولی ملاقاتی سے آشنانہ کھل سکتا، نہ صرف یہ بلکہ ان کے پورے خاندان سے مومن کے مخلصانہ مراسم تھے اور اس خاندان کے بیشتر افراد مومن کے شاگرد تھے چنانچہ ان کے فرزند ارجمند یوسف علیخاں بھی مومن کے شاگرد اور مخلص تھے چنانچہ ۱۲۶۳ھ میں وہ دہلی آئے تو مومن نے بڑی مسرت سے ان کا خیر مقدم کیا اور نہایت ہی بزرگانہ اور استادانہ شان سے تاریخ کہی ؎

بہ عمرِ خضر نیز رشکِ زلیخا	جواں سال یوسف علی خاں بہادر
رساند گدارا بہ اوجِ عزیزی	زرو مال یوسف علی خاں بہادر
بروگدیہ نقد حصول آرزوہا	زآمال یوسف علی خاں بہادر
ظفر در رکاب و کرم گرد راہش	خوشا حال یوسف علی خاں بہادر
تواں یافت سال ورودش بدہلی	زاقبال یوسف علی خاں بہادر

۱۲ ۶۳

(یوسف علی خاں میں اقبال کا تدخلہ ہے)

تفضّل حسین خاں

مومن کے مخلص دوستوں میں نواب تفضل حسین خاں بھی تھے جو نواب تجمل حسین خاں کے بھائی تھے، یہ تجمل حسین خاں وہی ہیں جن کے متعلق غالب نے کہا تھا ؏

بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

مومن کے تعلقات تفضل حسین خاں سے بہت زیادہ تھے انشائے مومن میں کئی رقعات اُن کے نام نظر آتے ہیں اور فارسی دیوان مومن میں ایک قطعہ تاریخ بھی ملتا ہے جو ان کے خفا ہو کر دہلی سے چلے جانے پر مومن نے کہا ہے اس کے لفظ لفظ سے محبت و اُلفت ٹپکتی ہے ؎

جہان فضل تفضل حسین خاں ناگاہ	جدا شد از من و گشتم غریب ہم بدیار

خشتید موّمن وزیں غصہ آہ پیہم زد — دو بیست بود چو اندیشہ ام گرفت شمار
بگفتمش کہ بہ ہر حرفِ تست مضمونے — تو شاعرے نبود آہ و نالہ ات بیکار
مگر بطرز نوی گفتہ باشی ایں تاریخ — نگفت ہیچ مگر زد نشس آہ دیگر بار

چونکہ عام طور پر رنجش اور جدائی کی تاریخیں کہی نہیں جاتی ہیں اور اس کے پہلے شعر میں جدائی کا ذکر ہے اس لئے دیوان کے مرتب نے پہلا شعر دیکھ کر اسے تاریخ وفات سمجھ لیا اور یہی عنوان لکھ دیا ہے، یہ جدائی اور خفگی کی تاریخ کہنا بھی موّمن ہی کی جدت ہے۔
انشائے موّمن سے بھی اس واقعہ کی تصدیق ہوتی ہے مگر یہ جدائی اور خفگی بہت جلد ختم ہو گئی اور پھر یہ دونوں آپس میں شیر و شکر ہو گئے موّمن خاں کے بیٹے احمد نصیر خاں کو انہوں نے اپنے پاس رکھ لیا تھا معلوم نہیں گود لیا تھا یا متبنیٰ کیا تھا بہر حال احمد نصیر خاں انھیں کے پاس رہتے تھے جن کا ذکر موّمن کے رقعات میں ہے، اس سے اِن دونوں کے مراسم کا پتہ چلتا ہے کہ کیسے تھے۔

وہ تفضل حسین یارِ قدیم — نیک خو نیک ذات نیک سیر
گرم سامانِ بزمِ سور ہوا — بہرِ چشم چراغ اہلِ نظر
میر نواب بے نظیر جہاں — کیا خجستہ پدر سعید پسر
کد خدائی کا کیا کہوں ساماں — زیب کے دل میں کر لیا ہے گھر
مہر داماد و ماہ پارہ عروس — ایک سے ایک عالم آرا تر
فکرِ تاریخ میں سنا میں نے — کہہ رہا تھا سروشِ نیک اختر
کہہ دے اے موّمن ستارہ شناس — سالِ عقدِ اجتماعِ شمس و قمر
۱۲۶۱

شادی کے بعد موّمن نے تفضل حسین کے کنواں کھدوانے کی تاریخ کہی ہے سہ

پئے سالِ تاریخ ایں چاہ پاک — کہ ہر دلو آبش بود قلتین
رقم کرد موّمن کہ نابود شد — عطش ہا ز ہیر تفضل حسین

پھر ان کے مکان کی تاریخ لکھی ہے ؎

بناکرد قصرے تفضل حسین | کہ از قلعۂ آسماں محکم است
چہ خرم مکانے کہ تاریخ آں | بنا شد تماشہ گہ عالم است

پھر اس قصر کے اطراف باغ لگایا گیا تو مومن نے تاریخ لکھی ؎

بنا نمود تفضل حسین باغ و چہ باغ | کہ ہیچ جائے چنیں باغ نیست در دنیا
بفکر سال شدم بر فلکہ گفت سروش | فراگرفت زمیں را حدیقۂ غلبا
۱۲ ۳ ۶۷

دیگر

ایں روضہ تا بنا شدہ جنت ز آسماں | آمد پئے نظارہ و از شرم رخ نہفت
باغیکہ گشت دولت بیدار از آنِ او | در زیر سایۂ شجرش ہر کسیکہ خفت
باغیکہ پیش از آمدن نو بہار ہا | ہر نخل بار ور شدہ و ہر شاخ گل شگفت
تاریخ رنگ ریزی ایں تازہ بوستاں | مومن کہ ہست بلبل گلزار نظم گفت
تا ور رسید باغ بہار و ہوائے گل | خود خار و خس زباغ تفضل حسین رفت

اس قطعۂ تاریخ کے کہنے کے دوسرے ہی سال مومن تو اللہ کو پیارے ہوگئے مگر تفضل حسین خاں نے بڑی لمبی عمر پائی تھی، ابوالکلام آزاد کا بیان ہے کہ " نواب تفضل حسین خاں اور ان کے بھائی والد مرحوم کے نانا رکن الدین (منور علی) کے مرید تھے، غدر میں تفضل حسین خاں نے انقلابیوں کا ساتھ دیا اور لکھنؤ کے سقوط کے بعد برجیس قدری فوج نیپال کی طرف ہٹنے لگی تو نانا کی فوج کے ساتھ یہ بھی اسی طرف کو آگئے پھر دو معرکوں کے بعد انہوں نے اپنے تئیں انگریزوں کے حوالے کر دیا، اور اس شرط پر کہ انھیں مکہ معظمہ بھجوا دیا جائے، چنانچہ فوجی حراست میں وہ جدہ پہنچا دیئے گئے۔ والد مرحوم کہتے تھے کہ تفضل حسین خاں بہت شوقین اور خوش پوشاک رئیس تھے، کشمیر کے تاجر پہلے ان کے پاس جاتے پھر لکھنؤ کا رخ کرتے تھے لیکن جب مکہ معظمہ پہنچے تو یہ حال تھا کہ چھینٹ کا ایک میلا انگرکھا جسم پر تھا، یہ حال

دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے، میں نے ہر چند کوشش کی کہ ان کی ضروریات کا انتظام کر دوں
مگر انہوں نے قبول نہیں کیا، وہ کہتے تھے میں آپکے خاندان سے ارادت رکھتا ہوں میری جگہ نذر
پیش کرنے کی ہے نہ کہ لینے کی، بہر حال چند دنوں تک مہمان رہے پھر والد مرحوم نے شریف
سے انھیں ملا دیا، اس بے نوائی کی حالت میں بھی انہوں نے گوارا نہیں کیا کہ بغیر کسی تحفے کے
ملیں ایک قیمتی تسبیح انکے پاس رہ گئی تھی، وہی بطور تحفہ پیش کر دی،

کئی سالوں کے بعد جب شاہ جہاں بیگم والیۂ بھوپال حج کو گئیں تو والد مرحوم نے ان کے حال
پر توجہ دلائی انہوں نے رباط مکہ کی سالانہ رقم کے ساتھ ایک رقم ان کے لیے بھی مقرر کر دی
آخر تک یہ معمول رہا کہ ظہر کے اول وقت حرم شریف میں آتے پھر عشا پڑھ کر گھر واپس جاتے"[۵۱]

مرزا غالب

بود ہم پیشہ با ہم پیشہ دشمن

مشہور ہے اور یہ صحیح بھی ہے مگر مومن کے ساتھی جتنے بھی تھے ان میں کوئی پیشہ ور شاعر
نہ تھا اور نہ خود مومن کا پیشہ شاعری تھا اس لئے ہم پیشگی کی دشمنی مومن کو کسی سے نہ تھی، غالب
نے گو آخری زمانے میں شاعری کو ذریعہ معاش بنا لیا تھا مگر شروع سے وہ پیشہ ور شاعر
نہ تھے اور مومن کی زندگی میں تو ان کو شاعری کو ذریعہ معاش بنانا بھی نہ پڑا تھا، اس لئے
غالب اور مومن میں وہی خلوص محبت اور دوستی تھی جو آزردہ، شیفتہ، فضل حق، صہبائی
نسیم، وحشت وغیرہ میں تھی، اس خلوص و یگانگت کے علاوہ اہل فن کی سی ہم آہنگی بھی
تھی، مومن کے انتقال پر غالب نے حقیر کو خط لکھا ہے،

"سنا ہوگا تم نے مومن خاں مر گئے آج ان کو مرے ہوئے دسواں دن ہے،
دیکھو بھائی! ہمارے بچے مرے جاتے ہیں، ہمارے ہم عمر مرے جاتے ہیں،

---

۵۱ نقش آزاد صہ ۳۲۸، ۳۲۹

قافلہ چلا جاتا ہے اور ہم پا در رکاب بیٹھے ہیں مومن خاں میرا ہمعصر تھا اور یار تھا، بیالیس تینتالیس برس ہوئے یعنی چودہ پندرہ برس کی میری اور اس مرحوم کی عمر تھی کہ مجھ میں اس میں ربط پیدا ہوا، اس عرصے میں کبھی کسی طرح کا رنج و ملال درمیان نہیں آیا۔

حضرت! چالیس برس کا دشمن ہی نہیں پیدا ہوتا دوست تو کہاں ہاتھ آتا ہے؟ یہ شخص اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا طبیعت اس کی معنی آفریں تھی"[1]

مومن ہی کے رنگ میں غالب نے ان کے مرنے پر ایک رباعی بھی کہی ہے ؎

شرط است کہ روئے دل خراشم ہمہ عمر | خوں نابہ برخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بمرگ مومن | چوں کعبہ سیہ پوش نہ باشم ہمہ عمر

خواجہ حالی کا بیان ہے کہ "(غالب نے) مومن خاں کا جب یہ شعر سنا ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا | جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو اس کی بہت تعریف کی اور یہ کہا کہ کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھے دیدیتا اس شعر کو انھوں نے اپنے متعدد خطوں میں نقل کیا ہے"[2]

پنج آہنگ میں غالب کے چند رقعات بھی مومن کے نام نظر آتے ہیں جن سے ان دونوں کی دوستی اور یگانگت کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مومن سالانہ (نجومی) تقویم غالب کو بھیجا کرتے تھے،

مومن بھی غالب کے مداح اور معترف تھے، غالب نے ایک غزل کے مقطع میں اپنے تئیں علی حزیں کا مثل قرار دیا ہے ؎

تو بدیں شیوۂ گفتار کہ داری غالب | گر ترقی نہ کنی شیخ علی را مانی

---

[1] نادرات غالب ص ۲۴، [2] یادگار غالب ص ۸۴،

مومن نے اس مقطع کو سن کر کہا کہ اس میں بالکل مبالغہ نہیں ہے' مرزا کو ہم کسی طرح علی حزیں سے کم نہیں سمجھتے [1]۔

دو اساتذہ کا جو ہم فن ہوں ہم عہد ہوں اس طرح ہم سخن اور ہمنوا ہونا یہ اس زمانے کی رواداری اور شرافت تھی آج اس قسم کے دو شخص کبھی یہ خلوص و محبت پیدا نہیں کر سکتے'

شیفتہ

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ بنگش خاندان سے تھے' ولی داد خان بنگش کوہاٹ سے دہلی آئے اور اپنے بیٹے مرتضیٰ خاں کی شادی اسمٰعیل بیگ خاں ہمدانی سپہ سالار کی بیٹی سے کر کے دہلی ہی میں رہ گئے۔ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے انگریزی سلطنت کی بنا ڈالی تو مرتضیٰ خاں کو دہلی کے قریب ہوڈل پلول کا علاقہ دیا اور اس عہد میں جو سات با اختیار رئیس بنائے گئے ان میں سے ایک یہ بھی تھے۔

۱۸۱۴ء میں راجہ کھودس راؤ کا علاقہ جہانگیر آباد بہ علت عدم ادائی مالگزاری نیلام ہوا تو مرتضیٰ خاں نے اسے خرید لیا اور حکومت سے اس کی سند تعلقداری بھی لے لی اور پھر یہ علاقہ اپنی زندگی ہی میں اپنے فرزند مصطفیٰ خاں کے نام منتقل کر دیا' بعد میں ہوڈل پلول کا علاقہ انگریزوں نے واپس لے کر اس کے معاوضے میں پنشن جاری کر دی جو غدر تک ملتی رہی۔

مصطفیٰ خاں ۱۸۰۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے' دہلی کے مشہور بزرگ میاں جی مالا مال سے عربی فارسی پڑھی حاجی نور محمد نقشبندی سے حدیث پڑھی جس کی تکمیل مکہ معظمہ میں شیخ عبداللہ سراج اور مدینہ منورہ میں شیخ عابد سندھی سے کی اور پھر شاہ غلام علی دہلوی کے خلیفہ مولوی کرم اللہ محدث سے بھی استفادہ کیا'

---

[1] یادگار غالب ص ۲۰۵' ۲۰۶'

ان میں علم و امارت دونوں کی شان تھی، نہایت ہی خلیق، متواضع، مہمان نواز تھے، خط بڑا پاکیزہ تھا۔ گھوڑوں کا بھی بہت شوق تھا صوم و صلوٰت کے اتنے پابند تھے کہ نماز پنج گانہ با جماعت مسجد میں پڑھا کرتے تھے، ابتداً شاہ اسحٰق سے بیعت کی ان کے وصال کے بعد شاہ ابو سعید اور شاہ احمد سعید سجادگان شاہ غلام علی نقشبندی سے استفادہ باطنی کرتے رہے، آخر میں شاہ عبدالغنی سے بیعت کی اور سلسلہ نقشبندیہ میں خلافت لی۔ شاہ عبدالغنی کی توجہ سے شاہ صاحب کے خلفائے اجل میں شمار ہوتے تھے، چنانچہ شاہ صاحب اپنے مریدوں کو تکمیل کے لئے انھیں کے پاس بھجواتے تھے۔

سنہ ۱۲۵۴ھ میں حج کو گئے اور سنہ ۱۲۵۶ھ میں دو سال چودہ روز کے بعد واپس ہوئے اپنا سفرنامہ بھی مرتب کیا تھا جو طبع ہو چکا ہے چونکہ دلی ہی میں قیام رہا اور مفتی صدرالدین خاں کے پڑوس ہی رہتے تھے اس لئے مفتی صاحب اور پھر مومن سے بھی مراسم بڑھے، شیفتہ کو مومن آزردہ اور وحشت سے بڑی محبت تھی مومن اور وحشت ان کے ہمراز تھے اور ہم مشرب بھی مگر مفتی صاحب باوجود متقی ہونے کے ان کے بڑے ہی مخلص تھے، غالباً شاعری شروع کرنے کے بعد ہی سے مومن کو غزل دکھانے لگے اور اردو فارسی دونوں زبانوں میں مومن ہی سے تلمذ رہا، اردو میں شیفتہ فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے اور دونوں زبانوں میں دیوان مرتب کر لئے تھے جو طبع ہو چکے ہیں،

مومن اور شیفتہ نے خوب رنگ رلیاں کیں جب جی بھر گیا تو حج کا ارادہ کیا اور تائب ہو گئے چنانچہ خود ان کا بیان ہے کہ ؎

اے شیفتہ جب سے کہ ہم آئے ہیں حرم سے ۔۔۔ شوق صنم و خواہش صہبا نہیں رکھتے

شیفتہ اور مفتی آزردہ کے گھر پر ہر ہفتہ باری باری سے مشاعرہ ہوتا تھا یہ معمول مومن کے انتقال تک جاری رہا، غدر کے بعد شیفتہ اور آزردہ دونوں قید و بند میں مبتلا ہو گئے مگر جب نجات ملی تو دونوں اکٹھے ہو گئے اس وقت دہلی میں تین ہی بزرگ رہ گئے تھے،

آزردہ، شیفتہ اور غالب، اور یہ تینوں بھی ایک ہی سال چند مہینوں کے فاصلے سے آگے پیچھے جنت کو سدھارے۔

مومن کا پہلا دیوان شیفتہ ہی نے مرتب کیا تھا، جس پر انہوں نے دیباچہ لکھا ہے، یہ دیباچہ اب تک ہر دیوان کے ساتھ طبع ہوتا جا رہا ہے۔ تذکرہ گلشن بے خار میں شیفتہ نے مومن کے متعلق لکھا ہے۔

"بایں ہمہ صفات کہ مذکور شد بے تحریک محرکے بہ فکر سخن نمی پرداز و چنانچہ اکثر کاوش بخواہش داعی آثم صورت ظہور گرفتہ و ہم تدوین انکارش را نقیر باعث گشتہ دیباچہ آں کہ ریختہ خامہ من است در آں بہ تفصیل ایں ماجرا باز کردہ ام"[1]

مومن نے گلشن بے خار پر تقریظ لکھی ہے اور کئی تاریخیں بھی کہی ہیں، شیفتہ کے سارے بیٹوں کی ولادت کی تاریخیں بھی کہی ہیں ایک مثنوی اور بہت سی رباعیاں ان سے متعلق کہی ہیں، جب تک مومن زندہ رہے، یہ دونوں ایک جان دو قالب رہے، مثنوی "حنین مغموم" میں مومن نے ان کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

شیفتہ سر دفتر اہل قلم — نکتہ خاطر نشاں جس کا رقم
بے عدیل و بے سہیم و بے بدل — بے نظیر و بے مثال و بے مثل
راز داں نکتہ ہائے کس مداں — معنی کرسی نشیں خاطر نشاں
ہم نفس ہمدم رضا جو دوستدار — شیفتہ دلدار و والہ جاں نثار
یار جانی محرم راز نہاں — بے ریا مونس کوئی ایسا کہاں
محو امید و تمنائے وصال — بعد میرے زندگی اس کی محال

مومن کے مرنے کے بعد بھی شیفتہ اُن کے متعلقین کی امداد و اعانت کرتے رہے، چونکہ غالب

---

[1] گلشن بے خار ص

شروع ہی سے دوستی تھی اس لئے مومن کے انتقال کے بعد غالب سے ربط ضبط بڑھ گیا، غالب اور شیفتہ ایک دوسرے سے دوستانہ مشورہ کرتے تھے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ شیفتہ کی مشق خاصی تھی انھیں اصلاح کی قطعاً ضرورت نہ تھی مگر جس طرح غالب اپنی غزل سنا کر ان کی پسندیدگی کے بعد دیوان میں درج کرتے تھے، اسی طرح یہ بھی کرتے ہوں گے، البتہ شیفتہ نے غالب کی امداد و اعانت بڑی کی ہے، چنانچہ جب قمار بازی کے سلسلہ میں غالب کو قید ہو گئی تو ان کے عزیز اور جانشیں نیر درخشاں نے خفاش بن کر آنکھیں پھیر لیں اور پھر غالب سے اپنی اور اپنے خاندان کی بے تعلقی کا اعلان تک اخبار میں چھپوا دیا مگر شیفتہ نے جیل جا جا کر غالب سے ملاقات کی اور ان کی رہائی کی کوشش کی اور ہر طرح امداد و اعانت کرتے رہے اور مرنے تک غالب کا ساتھ دیا۔

۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۹ء میں شیفتہ نے انتقال کیا نساخ نے قطعہ تاریخ کہا ؎

از مرگ حسرتی بلبل داستاں اوست	افسوس ہائے ہائے صد افسوس حسرتی
نساخ مصرعہ پے تاریخ زد رقم	صد حیف حیف وائے صد افسوس حسرتی

۱۲۸۶

خواجہ حالی ابتداً شیفتہ کے پاس محاسب کی حیثیت سے ملازم ہوئے پھر ان کے فرزندوں کے اتالیق کی حیثیت سے ۱۸۶۲ء سے ۱۸۶۹ء تک انھیں کے گھر پر مقیم رہے انھیں ذوق شعری شیفتہ ہی کی صحبت میں پیدا ہوا اور شیفتہ ہی کی وجہ سے غالب کے پاس آمد و رفت ہوتی۔

شیفتہ سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی علیگڈھ کے اولین رکن اور سرسید کے دوست تھے اور ان کے پوتے حاجی محمد اسحٰق خاں مسلم یونیورسٹی کے آنریری سکریٹری رہے جن کے فرزند اسمٰعیل خاں بیرسٹر بھی بڑے قابل اور قومی کارکن تھے، شیفتہ کے اردو فارسی دواوین اور سفرنامہ اور تذکرہ گلشن بے خار طبع ہو چکے ہیں نمونۂ کلام اسی کتاب میں شاگردان مومن کے تحت نقل کیا جا رہا ہے۔

ہم نے اس عنوان کے تحت صرف دس حضرات کو لیا ہے اگر اسے وسعت دی جاتی تو

تذکرۂ اہلِ دہلی بن جاتا اس لئے اختصار پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

مومن کے معاصرین

مشاہیر دہلی تقریباً مومن کے مخلص اور دوست تھے اور سربرآوردہ لوگ سب کے سب مومن کے احباب میں داخل تھے مگر بعض ایسے تھے جو شاعرانہ رشک و رقابت کی وجہ سے یا اپنی مصروفیات کے باعث مومن سے دور دور رہتے تھے مگر ان سے بھی مومن کو دشمنی نہ تھی بلکہ ملاقات علیک سلیک ہوتی ہی رہتی تھی چنانچہ ایسے ہی چند بزرگوں کا ذکر کرتا ہوں۔

استاد ذوق

ذوق چاہے مومن سے ناخوش ہوں کیونکہ مومن کے آگے ان کا چراغ نہ جلتا تھا، مگر مومن ان سے ناخوش تھے اور نہ اُن کے دشمن بلکہ کبھی کبھار ان سے ملتے ہی رہتے تھے، چنانچہ اصغر علی نسیم نے آسمان کے لئے ناگہاں کے لئے" طرح رکھ کر مشاعرہ کیا تو مومن کو ساتھ لے کر ذوق کے گھر گئے، اور ذوق نے مشاعرے کی دعوت بھی قبول کر لی یہ" پہلا مشاعرہ تھا جسے آزاد نے دیدۂ شوق سے دیکھا تھا[1]"

خواجہ عبدالمجید دہلوی نے اپنے ایک عنایت نامے میں مجھے تحریر فرمایا ہے کہ چاندنی چوک میں نواب ضیاء الدولہ کے مکان پر مشاعرہ ہوا کرتا تھا جس میں مومن، غالب اور ذوق سبھی شریک ہوتے تھے، اس مشاعرے میں ذوق نے بندت اور کھنڈت والا قصیدہ سنایا جب اس شعر پر پہونچے ؎

قل ہوا زہد کا قلیا ہوئی زاہد کی تمام ۔۔۔ سنتے ہی قلقل مینائے شراب عشرت

تو مومن نے کہا "واہ شیخ جی تم نے چاروں قل باندھ دیئے کمال کیا ہے"۔ یہ الفاظ سنتے ہی ذوق اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہو گئے اور مومن کو آداب کیا، یہ بات لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی

---

[1] آب حیات صفحہ ۵۱۴

توکسی نے مومن سے پوچھا کہ حضرت۔ یہ کیا بات تھی، مومن نے کہا عام طور پر شعراء نے اب تک دو قل باندھے تھے مگر چند روز پہلے آمانی[1] نے تین قل باندھ دیئے تھے اور کہا تھا ؎

محفل میں شور قلقلِ مینا و مل ہوا　　　لا ساقیا شراب کہ توبہ کا قل ہوا

مگر اب شیخ جی نے اپنے شعر میں چاروں قل باندھ دیئے ہیں" یہ سن کر اہلِ مشاعرہ نے مکرر سننے کی خواہش کی اور ذوق نے دوبارہ شعر سنایا اور خوب داد ملی اس داد پر ذوق کی خوشی کی انتہا نہیں رہی، جب کوئی داد دیتا تو وہ نہ صرف داد دینے والے کو سلام کرتے بلکہ مومن کو بھی سلام کر لیتے تھے، اس طرح مومن اپنے مخالفین کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کیا کرتے تھے، چاہے ذوق مومن کے مخالف ہوں، مگر انہوں نے کبھی مومن کی علانیہ مخالفت کی ہمت نہیں کی۔

علوی

مولوی عبداللہ خاں علوی دہلی کے مشہور فاضل اور صہبائی کے استاد تھے مومن اور مفتی آزردہ کے دوست تھے، شیفتہ کے مخصوص مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور مومن کے معترف و مداح تھے، ۱۲۶۲ھ میں فرخ آباد میں انتقال کیا، کسی نے تاریخ وفات کہی ہے

ہاتف گفتا نماند بنیاد سخن[2]

عیش

حکیم آغا جان عیش، شہزادہ شاہ رخ مرزا (فرزند ظفر) کے استاد تھے چونکہ درجہ سوم کے شاعر تھے، اور مومن و غالب کے آگے چراغ نہ جلتا تھا، اس لیے ان دونوں سے خفا رہتے تھے، قلعہ کے تعلق کی وجہ سے ذوق کا نام البتہ نہ لیتے تھے مگر مومن اور غالب پر علانیہ حملے کرتے رہتے مومن نے مطلع کہا ؎

ہم جان فدا کرتے گر وعدہ وفا ہوتا　　　مرنا ہی مقدر تھا وہ آتے تو کیا ہوتا

---

[1] امانی دلی کا نانکروب اور اپنی قوم کا چودھری تھا، خدا نے طبع موزوں دی تھی شعر خوب کہتا اور مشاعروں میں بھی شریک ہوتا تھا، [2] گوہرین نامہ ص۶۷۔

تو اُسے سن کر عیش نے کہا ؂

ہے عیش تنک ظرفی معشوق سے یہ کہنا　　ہم جان فدا کرتے گر وعدہ وفا ہوتا

عیش نے اجمیری دروازے کے مشاعرے میں غالب کو مخاطب کر کے یہ قطعہ پڑھا ؂

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے　　مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے

کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے　　مگر اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اس قطعہ کو سن کر مولوی مملوک علی نے کہا حکیم صاحب! ہم تو ان کا کہا سمجھتے ہیں اس پر مومن نے کہا اس قطعہ کے تیسرے مصرعے میں بھی حکیم جی نے تعلی کی ہے مطلب یہ ہے کہ حکیم جی میر اور مرزا کا کلام سمجھ نہیں سکتے۔ غرض مومن اور غالب کی زندگی بھر حکیم صاحب نے مخالفت کی اور ہو نس ہوس کر سب کو کھانے کے بعد ۱۲۹۷ھ میں کہیں انتقال کیا[1] یہ مومن کے خاصے دشمن اور مشاعروں میں منہ آنے والے تھے مگر مومن نے کبھی بھی ان کو اہمیت نہیں دی اور نہ ان کا کوئی جواب دیا۔

اوج

عبداللہ خاں اوج بھی حکیم آغا جان عیش کی طرح مومن اور غالب کے دشمن تھے، اور ہر وقت ان دونوں کے منہ آتے رہتے تھے، مگر مومن اور غالب دونوں بھی ان سے اعتنا نہ کرتے تھے، مومن نے کسی کا ہاتھ دیکھ کر کچھ کہا تو انہوں نے جل کر کہا ؂

وہ بیوقوف ہیں جو لکیروں کو ہاتھ کی　　کہتے ہیں ہے نوشتۂ تقدیر ہاتھ میں

کریم الدین

مولوی کریم الدین پانی پت کے رہنے والے تھے دلی میں تعلیم پائی اور وہیں رہ گئے ایک پریس بھی انہوں نے قایم کر لیا تھا۔ مومن کا پہلا دیوان[2] جسے شیفتہ نے مرتب کیا تھا انہوں نے

---

[1] مجلہ اورنگ آباد اکتوبر ۱۹۲۷ء ص ۶۴۸، و اکتوبر ۱۹۳۸ء ص ۵۸۲، ۶۱۸۔ [2] دیوان بے نظیر مطبوعہ ۱۸۴۶ء

بھی شائع کیا تھا، موتمن کے ملنے والے تھے اپنے دونوں تذکروں گلدستۂ نازنینان اور طبقات الشعرا میں انہوں نے موتمن کے حالات لکھے ہیں۔

موتمن نے تذکرہ گلدستۂ نازنینان کی تاریخیں اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہی ہیں اور یہ دونوں تاریخیں موتمن کے دیوانوں میں شریک نہیں ہوئی ہیں اردو تاریخ نقل کرتا ہوں ؎

سنئے کہ جس کا نام ہے اور ذات بھی کریم ۔۔۔ تالیف اک بیاض معانی نثار کی
وقت پسند طبع کی یہ موشگافیاں ۔۔۔ حیراں ہے عقل شانۂ گیسوئے یار کی
دیکھے جو اس کتاب میں الفاظ گرم گرم ۔۔۔ ......زباں درازنے چپ اختیار کی
اشعار عیش وصل کے آئے ہیں جب نظر ۔۔۔ حالت بدل گئی ہے دلِ بیقرار کی
مضموں جو اس میں طعنہ گردوں کے آگئے ۔۔۔ عزت بڑھی زمانۂ بے اعتبار کی
فخر گدائے کوچہ اشعار آبدار ۔۔۔ مٹی خراب ہے گہر شاہوار کی
کوئی تو لے گیا تھا یہ گلدستہ باغ میں ۔۔۔ بلبل کی وہ نوا ہے نہ رونق بہار کی
رنگینی سخن ہی کا چرچا ہے ہر کہیں ۔۔۔ یہ وجہ زردی رخ ہر گلعذار کی
از سنگ نقشِ علم سنی ہے سروش سے ۔۔۔ تاریخ اس صحیفۂ معجز نگار کی

اِحسانؔ

حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان دہلی کے مشاہیر سے اور موتمن کے مخالفین میں پیش پیش تھے انھیں نہ صرف شاہ اسمٰعیل شہید سے دشمنی تھی بلکہ موتمن سے بھی حسد تھا شاہ اسمٰعیل کے متعلق انھوں نے کہا تھا ؎

واعظا میرا تکفر پہ تعصب مت کر ۔۔۔ کہ تشہد کا بدل کرتا ہوں اقرار مدام
نخوت جبہ وعمامہ سے کیا کام مجھے ۔۔۔ مجھے انکار دوں کے البتہ ہے انکار مدام

چونکہ اسی زمانے میں موتمن خاں رباعیات کہہ کہہ کر بدعتوں کی دلخراشی کر رہے تھے اِس لئے

احسان نے جواباً کہا ہے ؎

جو اہلِ سخن پر آوازے کسے ناحق | شاگرد ہے شیطان کا ابلیس مقرر ہے
مردود ہے ملعون ہے مطعون خلائق ہے | مسلم نہیں مشرک ہے مومن نہیں کافر ہے

احسان نے طرح طرح سے مومن کی مخالفت کی مگر انہوں نے کبھی کوئی جواب دیا اور نہ انھیں درخور اعتنا سمجھا۔

میر ممنون

دہلی کے بزرگوں میں سے تھے مومن ان کا بہت احترام کرتے تھے اور یہ بھی مومن کے معترف اور مداح تھے کبھی کبھی اس جماعت میں شریک بھی رہتے اور ہفتہ وار مشاعروں میں بھی حصہ لیتے تھے ۱۲۶۷ھ میں وصال ہوا۔

حیا

شہزادہ مرزا رحیم الدین حیا مشاہیر شعرار دہلی سے تھے مومن سے شطرنج کی دوستی تھی کیونکہ انھیں شطرنج کا شوق تھا اور ولایت سے جو نقشے شطرنج کے دہلی کے رزیڈنٹ کے پاس آئے تھے وہ رزیڈنٹ انھیں کو حل کرنے دیتا تھا اور یہ مومن سے ان نقشوں کو حل کرا کر لے جاتے تھے مومن کے انتقال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

مومن کے احباب اور مشاہیر فن کا کچھ حال آپ نے سنا مگر یہ بھی یاد رہے کہ مومن عوامی حیثیت سے بھی دلی میں مقبول تھے، ان کے معاصرین، مفتی آزردہ، غالب اور ذوق کو عوام سے اتنی قربت نہ تھی جتنی قربت مومن کو تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ مومن کے فنون عوام کی دلچسپی کے تھے۔

مومن کے خسر خواجہ نصیر کی مجلسوں میں موسیقی داں اور بڑے بڑے استاد آتے تھے جو مومن کی موجودگی کی وجہ سے ان سے روشناس تھے اور فن موسیقی کی مناسبت اور واقفیت کی وجہ سے ان لوگوں سے بھی مراسم ہو گئے تھے، نجوم، رمل اور نقش و تعویذ کی وجہ سے

زیادہ تر عوام ہی موٹمن کا وقت ضائع کرتے تھے اور موٹمن بخندہ پیشانی ان کی فرمائشات کی تکمیل کیا کرتے تھے اس وجہ سے بھی عوام ان سے مانوس اور ان کے مداح تھے۔

طبی خدمت بھی ان کی مفت تھی تشخیص اور ترتیب نسخہ کی کوئی فیس وہ نہ لیتے تھے اس لئے عوام زیادہ سے زیادہ ان کی خدمت سے زیادہ فائدہ اُٹھاتے تھے۔

تحریک جہاد میں جو موٹمن نے پبلسٹی کی تو اس کا تعلق تمامتر عوام ہی سے تھا اور عوام ہی اُن کے مخاطب تھے' اس طرح وہ عوام سے زیادہ قریب رہے'

لالو کے معتوب ہونے پر موٹمن نے جو تاریخ لکھی ہے اس میں سب سے بڑا الزام اس پر "بدخواہیٔ خلق" کا لگایا ہے ؎

بدخواہ خلق لالو از قصر بازشاہی تا شد بروں چو اول بارِ دگر گذاشد

اسی طرح دہلی کے کوتوال کی معزولی پر تاریخ لکھی ہے تو اس میں بھی اس کی خلق آزاری اور رشوت خواری ہی نمایاں کی ہے ؎

شحنۂ دہلی خلق آزار بچۂ افغاں رشوت خوار

اس طرح عوامی تحریکوں میں موٹمن کا حصہ ثابت ہے'۔

غنیمت یہ ہوا کہ موٹمن نے غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے انتقال کیا ورنہ اگر وہ اس وقت رہتے تو یقیناً انگریزوں کے خلاف عوام کا ساتھ دیتے کیونکہ انھیں انگریزوں سے شدید نفرت تھی اور وہ ؎

ایں عیسویاں بلب رسانند جان من و جان آفرینش

کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالا کرتے تھے' یہی وجہ تھی جو انھوں نے تحریک ولی اللہی کو سمجھ کر اس میں حصہ لیا تھا'

تحریک ولی اللہی

دہلی میں حضرت عبدالرحیم ابن حضرت وجیہ الدین بڑے عالم صوفی اور مرتاض تھے

جن کا مدرسہ بہت مشہور تھا' اسی گھرانے میں ۴ شوال ۱۱۱۴ھ کو حضرت ولی اللہ نے جنم لیا' آپ کی ولادت کے چوتھے سال ۲۸ ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ کو شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے انتقال کیا اور ۱۱۳۱ھ کو حضرت عبدالرحیم کا وصال ہوا جن کے جانشین حضرت ولی اللہ ہوئے' شاہ ولی اللہ نے دہلی کے دس بادشاہوں کو دیدۂ عبرت نگاہ سے ملاحظہ فرمایا

۱- اورنگ زیب عالمگیر' ۲- بہادر شاہ اول' ۳- معز الدین جاندار شاہ' ۴- فرخ سیر' ۵- رفیع الدرجات' ۶- رفیع الدولہ' ۷- محمد شاہ' ۸- احمد شاہ' ۹- عالمگیر ثانی ۱۰- شاہ عالم ثانی' ۱۱۷۶ھ میں شاہ صاحب نے وصال فرمایا' اور دو سال بعد کلائیو نے الہ آباد کے مقام پر بنگالہ اور اڑیسہ کی دیوانی بادشاہ سے لیکر کمپنی کے حوالے کر دی'۔

۱۱۱۸ھ سے ۱۱۷۶ھ تک ساٹھ سالہ ہنگامے سادات بارہہ کا تسلط' فرخ سیر کی بے بسی اور موت تورانیوں کے ہاتھوں سادات کا زوال' مرہٹوں کی بغاوتیں اور ان کا عروج' نادر شاہ کی یلغار اور دہلی کا قتل عام' احمد شاہ ابدالی اور معرکہ پانی پت' ہندوستانی سیاست میں روہلوں کی شرکت اور مساہمت' ایرانی اور تورانی امراء کی رقیبانہ آویزش' یوروپین اقوام کی دست درازی' بنگال اور بہار پر انگریزوں کا عمل دخل اور دوسرے ضمنی ہنگامے شاہ صاحب نے بڑی تفصیل سے دیکھے تھے'

دہلی کی سلطنت کو ڈانواڈول دیکھ کر شاہ صاحب نے حجاز کا سفر کیا تو سلطنتِ عثمانی اور دوسری اسلامی مملکتوں کا حال بھی دیکھا اور سنا' چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں "احوال ہند بر ما مخفی نیست کہ خود مولد و منشاء فقیر است' بلاد عرب نیز دیدیم' واحوال مروم ولایت از ثقات آنجا شنیدیم" ظاہر ہے کہ شاہ صاحب نے اس طرح ہندوستان کی اور بیرونی سیاست کا تفصیلی مطالعہ کیا تھا' اور سفر حج سے واپسی کے بعد ہی قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ شروع کر دیا جو پانچ سال کے عرصے میں مکمل ہوا'

شاہ صاحب سیاست قرآنیہ کو پھیلانا چاہتے تھے اور قرآنی حکمت عملی پر ہندوستان کی

چلانے سے خواہشمند تھے، چنانچہ اسی دھن میں قرآنی حکمت کی اساسی فکر مسلمانوں کے سامنے پیش کی تھی ان کا نتیجۂ فکر یہ تھا کہ انسان کی عملی زندگی احکام قرآنیہ کی پابند ہونی چاہیئے، معاشرتی اجتماعی، ملی اخلاقی اور انتظامی خرابیوں کا باعث معاشی بحران اور اقتصادی عدم توازن ہے؟ اسی حکمت قرآنی اور اقتصادی عدم توازن کے اصول کو شاہ صاحب نے اپنے اصلاحی پروگرام کا مقصد بنا کر کام شروع کیا، چنانچہ دہلی میں رہنے تک غور کرتے رہے پھر حجاز میں بھی انہوں نے اسی پر غور کیا، تبادلۂ خیال بھی کیا اور دو سال حجاز میں رہ کر اسی گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتے رہے ۱۱۴۳ھ میں آپ نے ہندوستان چھوڑا تھا ۱۱۴۵ھ میں حجاز سے مراجعت کی، ۲۱ ذیقعدہ ۱۱۴۴ھ ۱۷۳۱ء جمعہ کی رات کو مکہ معظمہ میں شاہ صاحب نے ایک الہامی خواب دیکھا، جس کی تفصیل خود شاہ صاحب نے لکھی ہے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ خدائے تعالیٰ نے مجھے اس زمانے کا نظام قایم رکھنے میں ایک واسطہ بنایا ہے، اور میں نے دیکھا کہ کفار کا سردار مسلمانوں کے شہروں پر غالب آگیا ہے، اس نے ان کے اموال لوٹ لئے ہیں اور انھیں قید کر لیا ہے، اجمیر جیسے شہر میں کفار کے خصوصی احکام جاری ہو گئے ہیں اور اسلامی قانون ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ یہ دیکھ کر میں غضبناک ہو گیا اور میرے ساتھی بھی غیض و غضب میں مبتلا ہو گئے، اور انہوں نے مجھ سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کس طرح حاصل ہو سکتی ہے تو میں نے جواب دیا "فکّ کلّ نظام" یعنے تمام بوسیدہ نظاموں کو توڑ دو، اس کے بعد ہی اس ہجوم نے آپس میں جنگ شروع کر دی، پھر میں نے اپنے ساتھیوں کو لے کر ایک شہر پر دھاوا کیا اور ایک ایک شہر کو برباد کرتے ہوئے اجمیر پہنچا جہاں میرے ساتھیوں نے کفار کے سردار کو ذبح کر ڈالا[1]

اس خواب کی تعبیر کھلی ہوئی تھی، یہ اشارہ تمام جتھوں کی بڑھتی ہوئی قوت کی شکست کی طرف اجمیر کا ذکر اس میں اسلئے آگیا تھا کہ یہ دہلی کا روحانی مرکز تھا اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے

---

[1] فیوض الحرمین ص ۸۹،

اجمیر ہی سے اشاعت اسلام شروع کی تھی' اس خواب کے دو سال بعد ۱۱۴۶ھ میں باجی راؤ نے شمالی ہند پر حملہ کر دیا اور ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ نے یہ شیرازہ ہی بکھیر دیا اس کے بعد احمد شاہ ابدالی نے ایک سلسلہ ہی قائم کر دیا' اور پھر ۱۱۷۴ھ میں پانی پت کے مقام پر مرہٹوں کا خاتمہ ہی ہو گیا۔

اسی خواب نے شاہ صاحب میں انقلابی تحریک کا جوش بڑھایا اور انہوں نے اس تحریک کو آگے بڑھانا شروع کیا' اس کی ابتدا انہوں نے اپنے قرآن مجید کے ترجمے کی تدریس سے شروع کی اور اس پردے میں سارا انقلابی پروگرام اپنے معتقدین اور شاگردوں کے دلوں میں اور دماغوں پر نقش کرتے رہے' شاہ صاحب کی اس حکمت کو عوام سمجھ نہ سکے' ایک طرف شیعہ طبقہ ان کا مخالف ہو گیا تو دوسری طرف مشائخین نے ان پر یورش کر دی کیونکہ یہ لوگ عوام کو قرآن سے دور رکھنا چاہتے تھے اور اس کی من مانی توضیح و تشریح و تاویل کر کے اپنی دال روٹی چلا رہے تھے ان دونوں جماعتوں نے غنڈوں کو ساتھ لے کر شورش پھیلا دی' ایک روز مسجد فتح پوری سے نکلتے وقت شاہ صاحب پر حملہ بھی کرا دیا چونکہ ان دنوں دہلی پر نجف علی خاں کا تسلط تھا جو شیعی تھا اس لئے اس نے شاہ صاحب کے پنجے اتروا دیئے تاکہ ہاتھ بیکار ہو جائیں اور وہ تحریر نہ کر سکیں' چونکہ شاہ صاحب کی تحریک میں مرزا مظہر جان جاناں اور نجیب الدولہ بھی شریک تھے اس لئے نجف علی خاں نے مرزا مظہر جان جاناں کو تو شہید کرا دیا مگر نجیب الدولہ پر قابو نہ بن سکا پھر شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کو بھی شہر بدر کرا دیا۔

نجیب الدولہ نے ان حالات سے متاثر ہو کر شاہ صاحب کے مشورے سے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آنے کی دعوت دی اس کے نو سال بعد ۱۱۷۶ھ ۱۷۶۳ء میں شاہ صاحب نے وصال فرمایا اور شاہ عبدالعزیز کو جانشین فرما گئے۔

اس وقت شاہ عبدالعزیز کی عمر سترہ سال کی تھی شاہ ولی اللہ نے ان پر بڑی ذمہ داری ڈال دی تھی مگر انہوں نے بڑی ہمت اور جرأت سے اس بار امانت کو برداشت کیا اور آہستہ آہستہ

شاہ صاحب کے خیالات کی ترویج و اشاعت اس عمدگی کے ساتھ کی کہ رزیڈنٹ کو بھی جوان پر نگرانی کر رہا تھا کوئی شکایت پیدا نہ ہو سکی' پھر شاہ عبدالعزیز نے اپنے دونوں بھائیوں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کو بھی ساتھ لے لیا اور تینوں مل کر اس کام کو کرنے لگے'

مرہٹوں کا زور ٹوٹنے کے بعد انگریزوں کی ترقی کی رفتار بہت تیز ہو گئی' انہوں نے بنگال اور مدراس پر قبضہ کرنے کے بعد شمالی ہند کی طرف توجہ کی اور بکسر کی لڑائی میں ۲۳ اکتوبر ۱۷۶۴ء کو شاہ عالم کو اپنے قبضے میں لا کر ایک معاہدے کی رو سے تمام قلمرو مغلیہ کمپنی کے قبضے میں لے لی اور بادشاہ قلعہ سے قطب صاحب تک کا مالک رہ گیا۔

۱۸۰۶ء میں شاہ عالم فوت ہوئے تو اکبر شاہ ثانی سے ایک نیا معاہدہ کر کے انگریزوں نے انھیں برائے نام ہی بنا دیا اور "سلطنت شاہ عالم از دہلی تا پالم" رہ گئی مگر چند دنوں کے بعد پالم بھی نکل گیا اور بادشاہت قلعہ معلیٰ ہی کی حد تک محدود ہو گئی اس طرح تقریباً پورا ہندوستان انگریزوں کے زیر اقتدار آ گیا اور دہلی سے کلکتہ تک ان کی سیادت مسلم ہو گئی' البتہ دہلی کے شمالی صوبے چونکہ مدت پہلے ہندوستان سے کٹ گئے تھے اور ان پر مرکز کا اثر ہی نہ تھا اس لئے وہ محفوظ رہے' نادر شاہ نے کابل قندھار اور ٹھٹھہ کو ایران سے ملحق کر لیا تھا اور احمد شاہ ابدالی نے کشمیر اور لاہور اور ملتان کو ہندوستان سے الگ کر دیا تھا اس لئے یہ چھ صوبے دہلی سے الگ ہی رہے جو خود مختار رہے!

۱۱۷۶ھ میں احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر قبضہ کر لیا تھا۔ مگر یہ قبضہ زیادہ دنوں تک باقی نہ رہ سکا۔ کیونکہ ۱۸۰۰ء میں احمد شاہ کے پوتے زمان شاہ نے ہندوستان پر حملہ کر کے لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد دہلی پر حملے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ انگریزوں نے ایران کو ابھار کر افغانستان پر حملہ کرا دیا اور زمان شاہ کو

مجبوراً لدھیانہ سے واپس ہو کر کابل جانا پڑا، اس نے جاتے ہوئے رنجیت سنگھ کو پنجاب کا گورنر بنا دیا تھا، اس لئے رنجیت سنگھ نے ۱۲۲۳ھ / ۱۸۰۸ء میں ملتان، کشمیر اور پشاور پر قبضہ کر کے ایک مستقل حکومت قائم کر لی اور انگریزوں سے مصالحانہ معاہدہ بھی کر لیا، دکن میں مرہٹے اور پنجاب میں سکھ زوروں پر تھے حیدرآباد، لکھنؤ اور میسور کی حکومتیں برائے نام تھیں، مگر وہ شاہ دہلی کا احترام کرتی تھیں،

شاہ عبدالعزیز کا انقلابی پروگرام یہ تھا کہ پنجاب سے سکھ اور دہلی سے انگریز اقتدار ختم کیا جائے اس کے لئے وہ کابل اور قندھار کے حکمرانوں کو دعوت دے کر دہلی بلانا چاہتے تھے تاکہ وہ ان کی دعوت قرآنیہ کو قبول کر کے حکومت الٰہیہ قائم کریں یا اگر وہ اس کے اہل ثابت نہوں تو وہ چاہتے تھے کہ یہیں سے کسی کا انتخاب کیا جائے، چونکہ اس کے لئے امامت قائم کرنے کی ضرورت تھی اس لئے انھوں نے زمین ہموار کرنی شروع کی۔

سب سے پہلا کام انھوں نے یہ کیا کہ عوام میں جو غلط فہمی اسلامی عقائد اور اخلاق سے متعلق پھیلی ہوئی تھی اسے دور کیا جائے تاکہ لوگوں کے خیالات کی اصلاح ہو اور وہ صحیح مقام پر پہنچ سکیں، ساتھ ہی ساتھ انقلابی دعوت عام کے لئے انھوں نے ایک مرکز بنایا اور شاہ اسمٰعیل شاہ اسحاق اور مولوی عبدالحی سے کام لینا شروع کیا جن کے ساتھ شاہ یعقوب بھی تھے، چنانچہ شاہ اسمٰعیل کو ایسا تیار کر دیا کہ وہ نہایت ہی عمدگی سے کام کرنے لگے اور انھیں کے مشورے سے شاہ اسحاق کو امیر بنایا گیا، یہ کام چپکے چپکے ہوتا رہا اسی اثناء میں سید احمد بریلوی بھی دہلی پہونچ گئے، اور شاہ عبدالعزیز نے انھیں شاہ عبدالقادر کے پاس بھجوا دیا اور ان کی رہائش اکبری مسجد ہی میں رہی۔

۱۲۲۲ھ میں شاہ عبدالعزیز نے سید احمدؒ کو قادریہ، چشتیہ اور نقشبندیہ طریقوں میں بیعت کی اور انھیں اپنی ڈھب کا پا کر انقلابی جماعت میں بھی شریک کر لیا اور امیر جماعت بھی بنا دیا، یہ امارت در اصل امارت جہاد تھی کیونکہ امیر جماعت

شاہ اسحٰقؒ تھے اور امیر جہاد سید صاحب بنائے گئے چنانچہ ۱۸۱۸ء میں سید صاحب نے اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر دورہ شروع کیا اور مجاہدین کو ہموار کرنے لگے۔

سید صاحب نے ایک نیا طریقہ "طریقۂ محمدیہ" جاری کر دیا۔ ہندوستان میں سلسلۂ تصوف عام طور پر تین ہی تھے' قادریہ چشتیہ نقشبندیہ آخرالذکر سلسلہ ہی میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے انتساب سے طریقۂ مجددیہ بھی جاری تھا گویا سید صاحب کا طریقۂ محمدیہ ان سب سے الگ ہی تھا چنانچہ اسی سلسلہ میں انہوں نے بیعت لینی بھی شروع کی اور سفر حجاز بھی کیا اور بعد فراغت و زیارت دہلی واپس آکر جہاد کی تیاری میں مصروف ہو گئے بالآخر ۷ جمادی الثانی ۱۲۴۱ھ روز دوشنبہ م ۱۷ جنوری ۱۸۲۶ء کو مجاہدین کی جمعیت لے کر دہلی سے نکلے۔

جہاد کی پوری تیاری اور مکمل انتظامات شاہ اسحٰقؒ نے کئے خود شاہ اسمٰعیلؒ اور شاہ عبدالحئیؒ مجاہدین کے ساتھ ہو گئے' شاہ اسحٰقؒ دہلی سے رقوم بھجواتے رہے تھے' افسوس کہ شاہ عبدالعزیزؒ اس وقت حیات نہ تھے کیونکہ انہوں نے ۱۲۳۹ھ ہی میں وصال فرمایا تھا جبکہ سید صاحب حجاز میں تھے' مگر ان کے جانشین شاہ اسحٰقؒ نے ان کے بنائے ہوئے لائحہ عمل پر گامزن ہو کر بڑی عمدگی سے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

اس زمانے میں ایران میں بابی تحریک نجد میں وہابی تحریک اور یمن میں زیدی تحریک چل رہی تھی ولی اللٰہی تحریک کو ان تحریکوں سے کوئی تعلق نہ تھا یہ بالکل علٰحدہ اور مستقل اصلاحی تحریک تھی' بابی تحریک سے تو کوئی مناسبت یا مشابہت ہو ہی نہ سکتی تھی مگر زیدی تحریک سے بھی کوئی تعلق نہ تھا البتہ نجدی تحریک بعض امور میں مشترک ضرور تھی مگر پوری تحریک میں کوئی مطابقت نہ تھی۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ (متوفی ۷۲۸ھ) کے ماننے والوں میں ۱۱۱۵ھ میں سرزمین نجد میں محمد بن عبدالوہاب پیدا ہوئے' جنھوں نے عوام کو توحید کی دعوت دی'

حزب ولی اللہ میں بھی دعوت توحید ہی تھی اس کے سوا کوئی بات مشترک نہ تھی کیونکہ تحریک ولی اللہی عقلیت پسا ور ان کا فلسفہ وحدت الوجود کے مسئلہ پر مرتکز ہے انتہا یہ کہ وہ امام ربانی کے وحدت الشہود سے جس قدر شدید اختلاف رکھتے ہیں دنیا جانتی ہے، ظاہر ہے کہ جن دو تحریکوں کے اساس میں اتنا اختلاف ہو تو پھر بعض جزوی امور کی شابہت کی وجہ سے وہ ایک کس طرح ہو سکتی ہیں،

شاہ اسمٰعیل نے "التوسل فی الدعا" کو جائز قرار دیا ہے اور شرک اصغر کے مرتکب کو کافر نہیں کہتے مگر شیخ محمد بن عبدالوہاب کے پیرو نہ تو توسل فی الدعا کو جائز سمجھتے ہیں اور نہ شرک اصغر کرنے والے کو بخشتے ہیں اسی طرح بیشتر اختلافات ان دونوں تحریکوں میں ہیں جو ایک کو دوسری سے بالکل جدا کر دیتے ہیں،

گو یمنی تحریک بزرگ امام شوکانی جیسے محقق اور محدث کی تھی مگر وہ زیدی تھے اور اس تحریک سے اس کو بالکل ہی مطابقت نہ تھی، البتہ امام ربانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کو شاہ صاحب اپنا پیش رو مانتے تھے اور ان کا پورا پورا احترام کرتے تھے،

تحریک ولی اللہی سے مومن کی وابستگی

مومن کے والد حکیم غلام نبی خاں شاہ عبدالعزیز کے ارادت مند تھے اسی وجہ سے شاہ صاحب نے مومن کے کان میں اذاں کہی تھی، اور شاہ صاحب ہی نے نام تجویز فرمایا تھا گو مومن کی تعلیم شاہ عبدالقادر کے مدرسے میں ہوئی مگر وہ شاہ عبدالعزیز کے وعظ مسلسل سنا کرتے تھے، چنانچہ یہ جمعہ اور منگل کے وعظ مومن پر اثر کرتے رہے،

شاہ اسمٰعیل مومن سے عمر میں بہت بڑے تھے مگر استاد بھائی تھے چونکہ اوائل زمانہ میں یہ بھی میلوں ٹھیلوں کے شوقین اور خوش پوش تھے اس لئے مومن سے دوستی ہو گئی تھی اور دونوں ایک دوسرے کے معترف و مداح تھے، جب شاہ اسمٰعیل نے حزب ولی اللہی کا کام شروع کیا تو مومن کو بھی ہموار کر لیا چنانچہ ۱۲۳۱ھ سے مومن باقاعدہ اس تحریک میں

شریک ہو گئے چونکہ وہ سید احمد اور شاہ اسمٰعیل کی طرح محنت کش اور سخت کوش نہ تھے، اس لئے انہوں نے اپنی طبیعت کے لحاظ سے اس تحریک کی نشر و اشاعت کا کام اپنے ذمہ لے لیا اور شاہ اسمٰعیل کے ساتھ کام کرنے لگے چنانچہ ۱۲۳۶ھ میں شاہ صاحب نے بیعت جہاد لینی شروع کی تو مومن نے بھی بیعت کی، ۱۲۳۹ھ میں شاہ عبدالعزیز کا وصال ہوا تو مومن نے بڑے تاثر سے تاریخ کہی ؎

انتخاب نسخۂ دیں مولوی عبدالعزیز | بے عدیل و بے نظیر و بے مثال و بے مثل
جانب ملک عدم تشریف فرما کیوں ہوئے | آ گیا تھا کیا کہیں مردوں کے ایماں میں خلل
ہے ستم اے چرخ تو کس کو یہاں سے لے گیا | کیا کیا یہ ظلم تو نے بے کسوں پر اے اجل
جب اٹھائی نعش اک عالم تہ و بالا ہوا | لوٹتا تھا خاک پہ ہر قدسی گردوں محل
کیا کس و ناکس پہ تھا صدمہ کیا جو وقت دفن | ڈالتا تھا خاک سر پر ہر عزیز و مبتذل
مجلس ندرد آفریں تعزیت میں میں بھی تھا | جب پڑھی مومن نے یہ تاریخ آ کے بے بدل
دست بیداد اجل سے بے سر و پا ہو گئے | فقر و دیں فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

شاہ عبدالعزیز کے جانشین شاہ اسحٰق ہوئے جو حضرت کے نواسے اور انھیں کی طرح ہفتے میں دو بار وعظ فرمایا کرتے تھے۔ سرسید کا بیان ہے کہ میں ان کے وعظ میں حاضر رہتا تھا باہر مردوں اور اندر عورتوں کا ہجوم رہا کرتا تھا، بڑا ہی سلجھا ہوا وعظ کہتے تھے، اسی زمانے میں شاہ صاحبان نے مسجد بنوائی تو مومن نے تاریخ کہی ؎

نہے مسجد کہ بنیادش ز دینداری و تعمیرش | ز ابراہیم و اسحٰق و ز اسمٰعیل و یعقوب است
جماعت سر نہاد آنجا و تاریخ بناے او | عبادت خانۂ اسلام خوب است و بسا خوب است

اس خانوادۂ عالی میں شاہ عبدالحی سب سے زیادہ روشن خیال اور بہت بڑے فقیہ تھے، چنانچہ فقۂ حنفی اور سیاسیات میں آپ کی مہارت مشہور تھی، مومن سے بھی آپ کے مراسم خاص تھے مگر مومن نے ان کی سیاست دانی سے فائدہ نہیں اٹھایا۔

شاہ اسمٰعیل اور مومن کی دوستی میں شاہ صاحب کی وسیع القلبی اور وسعتِ نظر کا زیادہ حصہ نظر آتا ہے کیونکہ مومن کی وضع رنگین سے کبھی تعرض نہیں کیا اور نہ ان کی رندمشربی کی وجہ سے ان سے کنارہ کش ہوئے اسی وجہ سے مومن بھی انھیں جانتے تھے اور شاہ صاحب تو مومن کی ذہانت ذکاوت اور علمیت اور ان کے جوہر ذاتی کے معترف تھے، چنانچہ تقویت الایمان کی اشاعت کے متعلق شاہ صاحب نے علمائے دہلی کو جمع کر کے مشورہ کیا تو اس میں مومن کو بھی شریک کر لیا، اور پھر شاہ صاحب نے مومن ہی کی رائے پر عمل بھی کیا۔

شاہ اسمٰعیل اور شاہ عبدالحی کے جہاد پر جانے کے بعد مومن مرکز ہی سے وابستہ رہے اور دہلی کے مرکزی کاروبار میں ہاتھ بٹاتے اور نشر و اشاعت کا کام کرتے رہے مگر ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۸ء میں شاہ عبدالحی نے انتقال کیا اور ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء میں شاہ اسمٰعیل اور سید احمد بریلوی شہید ہو گئے تو مومن کو سکتہ ہو گیا اسی شدت الم میں انہوں نے ان بزرگوں کی تاریخیں بھی نہیں کہیں،

جماعت مجاہدین کی ناکامی اور شاہ اسمٰعیل اور سید احمدؒ کی شہادت کا اثر مومن پر اتنا ہوا کہ وہ عرصے تک خاموش رہے تحریک جہاد کی اس بری طرح ناکامی اور اس کے تار و پود بکھر جانے سے شاہ اسحٰق بھی بددل ہو گئے وہ نہایت مخلص اور نیک دل بزرگ تھے انہوں نے غور کیا کہ اب کوئی انقلابی تحریک نہیں چل سکے گی اِس لئے انہوں نے اس تحریک کا رخ بدل کر مذہبی تعلیم کی حد تک محدود کر دیا اور اس تعلیمی تحریک کا آغاز کر کے ہجرت کر گئے ان کی ہجرت کی تاریخ مومن نے کہی ہے

آں کشور دیں و جان اسلام	عرفان مصور و مجسم
از کشور ہند رخت بربست	بیزار ز کافران اظلم
اندیشہ سالِ ہجرت او	بر چرخ مہاجر و مکرم
ہم چشم مقربانِ حق بیں	ہمراز فرشتگانِ محرم

فرمود وحید عصر اسحٰق　　　بر حکم شہنشہ دو عالم
بگزاشتہ دار حرب امسال　　　جا کرد بہ مکہ معظم
۱۲۶۱ھ

شاہ اسحٰق نے ہجرت فرما کر مکہ معظمہ پہونچنے کے چند ہی مہینے کے بعد رجب ۱۲۶۱ھ ۱۸۴۵ء میں وصال فرمایا تحریک جہاد ختم ہو چکی ہے، اس تحریک کے چلانے والے بھی ختم ہو گئے۔ آخری علمبردار بھی رخصت ہو گیا مگر مومن ابھی ہندوستان کو دارالحرب ہی کہہ رہے ہیں اور کافران ظلم یعنی انگریزوں پر ان کا غصہ باقی ہے،

شاہ اسمٰعیل کے فرزند مولوی محمد عمر سے مومن کے عزیزانہ اور مخلصانہ مراسم تھے اور مولوی عمران کا بہت لحاظ کرتے تھے مولوی عمر کو قرب نبوی کی عزت حاصل تھی اور حالتِ جذب میں رہتے تھے، پھر بھی مومن انھیں ستاتے اور چھیڑتے رہتے تھے اور وہ سب کچھ برداشت کرتے رہتے تھے، چنانچہ امیر شاہ خاں راوی ہیں کہ مفتی صدرالدین خاں امام صاحب جامع مسجد اور چند دوسرے بزرگوں نے بیک وقت بیک شب خواب دیکھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جامع مسجد کے ممبر پر تشریف فرما ہیں اور مولوی عمر آپ کو مورچھل جھل رہے ہیں اور لوگوں سے کہہ رہے ہیں آؤ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کر لو یہ خواب تین چار بزرگوں نے بیک وقت دیکھا۔[۱]

امیر شاہ خاں نے یہ روایت بھی کی ہے کہ نواب مصطفیٰ خاں (شیفتہ) نے اپنا قصہ بیان کیا کہ ہم چند احباب جن میں مرزا غالب بھی تھے ایک بالاخانہ پر بیٹھے ہوئے تھے اور بلا مزامیر کا گانا ہو رہا تھا اتفاق سے مومن خاں کہیں سے مولوی محمد عمر کو پکڑ کر لائے وہ کہہ رہے تھے مجھے چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو مگر مومن خاں نے انھیں زبردستی لا کر مجلس میں بٹھا دیا، گانا ہوتا رہا اور مولوی عمر بے چین ہوتے رہے تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے ایک معمولی حرکت کی جس سے

---

[۱] امیر الروایات ص ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹،

سارا مکان ہل گیا۔ اس پر سب کو زلزلہ کا شبہ ہوا مگر بعض لوگوں کو مولوی عمر کی حرکت کا بھی خیال تھا تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے دوبارہ پھر ویسی ہی حرکت کی جو پہلے کی تھی اس سے مکان ہل گیا اور پہلے سے بھی زیادہ زور سے ہلا اب تو سب کو ان کی حرکت کا یقین ہوگیا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہی حرکت کی تو مکان کو اس زور سے حرکت ہوئی کہ چھت کی کڑیاں بول گئیں اور طاقچوں میں جو شیشہ آلات رکھے تھے وہ کھن کھن کرنے لگے اس پر کسی نے کہا مولوی عمر یہ کیا ہے؟ تو انھوں نے کہا میں تو پہلے ہی سے کہہ رہا تھا مجھے مت بٹھاؤ یہ کہہ کر اٹھ کر چلدیے۔[۱]

مولوی محمد عمر نے ۱۲۶۸ھ میں انتقال کیا تو مومن نے تاریخ کہی ؎

محمد عمر کا ہوا انتقال	بزرگ ایسے ہوتے ہیں پیدا کہاں
مجھے سال تاریخ کا تھا خیال	کہ سب نے کہا مرگ شیخ زماں

غرض مومن نے آخر تک اس خاندان سے تعلقات برقرار رکھے اور مر کر بھی انھیں کے قبرستان میں جگہ پائی۔

مومن اور سید احمد بریلویؒ

ولی اللہی تحریک کو لوگوں نے سید احمد بریلوی کی تحریک سمجھ کر "احمدی تحریک" کے نام سے مشہور کر دیا ہے کیونکہ اس میں پیش پیش وہی تھے چونکہ جہادی تحریک کے روح رواں سید احمد صاحب ہی تھے اس لئے یہ نام بھی زیادہ مشہور رہا چونکہ مومن سے سید صاحب کے گہرے مراسم تھے اور مومن ان سے بے انتہا متاثر تھے اس لیے ہم سید صاحب کے مختصر حالات لکھتے ہیں۔

سید صاحب کا سلسلہ چونتیس واسطوں سے امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے

---

[۱] امیر الروایات ص ۱۱۹

ان کا خاندان مدتوں علم و فضل میں ممتاز رہا، سید علم اللہ عہد عالمگیری میں بڑے عالم فاضل گزرے ہیں، جو سید عرفان کے تیسری پشت میں دادا ہوتے تھے اور یہ سید عرفان سید احمد صاحب کے والد تھے، سید صاحب ۶ صفر ۱۲۰۱ھ ۱۷۸۶ء کو بریلی میں پیدا ہوئے وہیں تعلیم و تربیت پائی مگر تین سال کی مکتب نشینی کے بعد بھی قرآن مجید کی چند سورتوں کے حفظ کرنے کے سوا کچھ نہ آسکا بچپن ہی سے مردانہ کھیلوں کا شوق تھا محلے کے ہم سن لڑکوں کو جمع کر کے لشکر بناتے اور نعرۂ تکبیر بلند کرتے پھرتے تھے ورزش اور سخت محنت کے عادی تھے، قوت و طاقت بھی غیر معمولی تھی پیراکی کا بھی بہت شوق تھا، اور خلق اللہ کی خدمت کی دھن بھی رہتی تھی محلہ والوں کا کام کاج کرتے رہتے تھے۔

سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں لکھنؤ کا سفر کیا چار چھ مہینے رہ کر وہاں سے دہلی پہونچے اور شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں پہونچے تو انہوں نے شاہ عبدالقادر کے پاس اکبری مسجد بھجوا دیا اور شاہ صاحب نے مسجد کا ایک حجرہ آپ کو دیدیا، چنانچہ مومن جب اکبری مسجد کے مدرسے میں جانے لگے تو سید صاحب وہاں مستقل طور پر مقیم تھے۔

جب سید صاحب نے پڑھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ آپ کی نظروں کے سامنے سے کتاب کے حروف ہی اڑ جاتے ہیں، اس لئے شاہ صاحب نے یہ فرما کر تعلیم موقوف کر دی کہ تمھیں کتابی علم کی ضرورت نہیں ہے۔

۱۲۲۲ھ میں آپ نے شاہ عبدالعزیز کے ہاتھ پر قادریہ چشتیہ اور نقشبندیہ سلسلہ میں بیعت کی جب ذکر و اشغال شروع ہوئے تو آپ نے شغل برزخ سے اس لئے انکار کر دیا کہ تصور شیخ کو آپ شرک سمجھتے تھے۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز نے شغل برزخ سے یہ فرما کر روک دیا کہ تمہیں ولایت انبیاء دی گئی ہے،

انکا زمانے میں مومن نے سید صاحب کو دیکھا اور ان سے واقفیت حاصل کی اس کے بعد ہی ۱۲۲۳ھ میں سید صاحب وطن گئے اور وہاں سے واپسی میں ۱۲۲۴ھ میں امیر خاں کے ساتھ

ہو گئے اور چند مہینے کے بعد وہاں سے دہلی چلے گئے اور پھر شاہ عبدالعزیز نے تحریک ولی اللہی میں شریک کر لیا اور شاہ اسمٰعیل کے ساتھ کام کرنے لگے اور شاہ اسمٰعیل نے مومن کو بھی اپنے ساتھ لے لیا مگر مومن صرف رائے مشورے اور بات چیت کی حد تک اِس تحریک سے متعلق تھے عملی طور پر انہوں نے کوئی حصہ نہیں لیا اور نہ اپنا وقت ہی اس میں دیتے تھے۔

تین چار سال کے بعد ہی سید صاحب نے طریقہ محمدیہ میں بیعت لینی شروع کر دی یہ طریقہ محمدیہ خود سید صاحب کا مخترعہ تھا، اس کی تشریح سید صاحب یوں کرتے تھے کہ زندگی کا ہر کام رضائے الٰہی کے لئے کیا جائے نکاح کی غرض یہ ہو کہ انسان فسق و فجور سے بچا رہے، تجارت یا ملازمت اس لئے کرے کہ حلال روزی کما کر خود کھائے اور اپنے اہل و عیال کو کھلائے۔ استراحت شب کا مقصد یہ ہو کہ جوف لیل میں اٹھ کر نماز ادا کر سکے اور نماز فجر اول وقت پڑھ سکے کھانا اس لئے کھائے کہ جسم میں بقدر ضرورت طاقت بحال رہے تاکہ احکام خداوندی مستعدی سے بجا لا سکے، نماز پڑھے روزہ رکھے حج کرے اور ضرورت پڑے تو جہاد کرے غرض چلنے پھرنے اٹھنے بیٹھنے سونے جاگنے میں مقصود احکام خداوندی کی بجا آوری اور مرضی باری تعالیٰ کی پابندی ہو گویا ہر فرد آئیہ مبارکہ ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی اللہ رب العالمین کا نمونہ ہو،

شوال ۱۲۳۶ھ میں سید صاحب نے چار سو افراد کو ساتھ لے جا کر حج کرنے کا ارادہ کیا اور کلکتہ پہنچ کر جہاز پر سوار ہونے تک مجاہدین کی تعداد سات سو ترانوے ہو گئی ان سب کو ساتھ لے کر سید صاحب نے حج کرایا اور ایک مہینہ مدینۂ طیبہ میں رہ کر ربیع الاول ۱۲۳۸ھ میں ہندوستان واپس ہوئے۔

سید صاحب کا خروج تھا تو انگریزوں کے خلاف مگر انہوں نے فی الحال سکھوں سے نپٹ لینا چاہا تھا، اس کے بعد وہ انگریزوں سے مقابلہ کرنا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے انگریزوں کو ذہن میں محفوظ رکھا اور سکھوں کے خلاف عام اعلان کر کے بیعت جہاد لینی شروع کی یہ بیعت جہاد بیعت محمدی سے الگ تھی، اسی خروج کی تاریخ مومن نے کہا ہے ؎

گلاب ناب سے دھوتا ہوں مغز اندیشہ　　　که فکر در حت سبط　　کوثر ہے
وہ کون امام جہان و جہانیاں احمد　　　کہ محض مقتدیٔ سنت پیمبر ہے
زمیں کو جبر فلک سے نہ کیوں ہو دعویٔ نور　　　کہ اس کا رایت اقبال سایہ گستر ہے
عروج سنگ در قصر جاہ پر کہ جسے　　　ہزار طعن حضیض اوج لامکاں پہ ہے
زبسکہ کام نہیں ہے اسے سوائے جہاد　　　جو کوئی اسکے مقابل ہے سو وہ کافر ہے
شرف ہے جبر کو اسکے زمانے سے دائم　　　زبس کہ روز و شب انصاف ہے برابر ہے
وہ بادشاہ ملائک جناب کوکب دیں　　　کہ نور شمس و قمر جسکے گرد لشکر ہے
وہ شعلہ خصلت حساد سوز کفر گداز　　　کہ جس کا نقش قدم ہر روز محشر ہے
وہ برق خرمن ارباب شرک و اہل ضلال　　　کہ شعلہ خوشہ حاصل تو دانہ اخگر ہے
وہ قہرمان فلک تومن و نجوم حشم　　　کہ ترک حشم غلام اسکا ہر چاکر ہے
وہ شاہ مملکت ایماں کہ جسکا سال خروج　　　امام برحق ہدی نشاں علی فر ہے
　　　۱۲　ہر　۴۲

دیگر

جو سید احمد امام زماں و اہل زماں　　　کرے ملاحدے دین سے ارادۂ جنگ
تو کیوں نہ صفحۂ ہستی پہ لکھے سال دغا　　　خروج ہدی کفار سوز کلک تفنگ
　　　۱۲ - ۴۲

پھر ایک جہادیہ مثنوی بھی چالیس شعر کی کہی ہے ؎

پلا ساقی مجھ کو شراب طہور　　　کہ اعضا شکن ہے خمار فجور
کوئی جرعہ دے دین افزا جام کا　　　کہ آجائے بس نشہ اسلام کا
برنگ مے ایمان کو آئے جوش　　　نہ اپنا رہے اور نہ دنیا کا ہوش
نہاد نہفتہ کو ظاہر کروں　　　دم تیغ سے قتل کافر کروں
پیے تشنہ کامی سبو در سبو　　　پیوں شوق سے ملحدوں کا لہو
یہی اب تو کچھ آگیا ہے خیال　　　کہ گردن کشوں کو کروں پائمال

بہت کوشش و جاں نثاری کروں　　کہ شرع پیمبر کو جاری کروں

- - - - - - - - - -

زہے سید احمد قبول خدا　　سر امتحاں رسول خدا
نکو گوہری کا نہ پوچھو شرف　　علی و حسین و حسن کا خلف

- - - - - - - - - -

خبردار ہو جاؤ اے اہل دل　　کہ رحمت برستی ہے اب متصل
ہوا مجتمع لشکر اسلام کا　　اگر ہو سکے وقت ہے کام کا
ضرور ایسے مجمع میں ہونا شریک　　کہ کوشش تم سے ہو وحدہٗ لاشریک
جو داخل سپاہ خدا میں ہوا　　فدا جی سے راہ خدا میں ہوا
حبیب حبیب خداوند ہے　　خداوند اس سے رضا مند ہے
امام زمانہ کی یاری کرو　　خدا کے لئے جاں نثاری کرو

- - - - - - - - - -

عجب وقت ہے یہ جو ہمت کرو　　حیات ابد ہے جو اس دم مرو
جو ہے عمر باقی تو غازی ہو تم　　سزاوار گردن فرازی ہو تم
یہ ملک جہاں ہے تمہارے لئے　　نعیم جناں ہے تمہارے لئے
شراکت یہاں کی ہے طالع کا اوج　　کہ ایسا امام اور ایسی ہے موج
سعادت ہے جو جاں فشانی کرے　　یہاں اور واں کامرانی کرے
الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب　　یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
الٰہی اگرچہ ہوں میں تیرہ کار　　پہ تیرے کرم کا ہوں امیدوار
تو اپنی عنایت سے توفیق دے　　عروج شہیدا و صدیق دے
کرم کر نکال اب یہاں سے مجھے　　ملا دے امام جہاں سے مجھے

یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں | مری جاں فدا ہو تری راہ میں
میں گنجِ شہیداں میں مسرور ہوں | اسی فوج کے ساتھ محشور ہوں

یہ شوقِ شہادت مومن کو اتنا ہو گیا تھا کہ غزل میں بھی اسی مضمون کو ادا کرنے کی بدعت کی ہے مومن ہمیشہ غزل میں دوسرے مضامین سے اجتناب کرتے رہے ہیں مگر اس جگہ اپنے اصول سے خود انحراف کیا ہے۔ ؎

خدایا ہاتھ اٹھاؤں عرضِ مطلب سے بھلا کیوں کر | کہ ہے دستِ دعا میں گوشہ دامانِ اجابت کا
عنایت کر مجھے آشوب گاہِ حشرِ غم اک دل | کہ جس کا ہر نفس ہم نغمہ ہے شورِ قیامت کا
جراحت زار اک جاں دے کہ جس کا ہر جراحت سے | نمکداں شورِ الفت کا مزا آوے عبادت کا
فروغِ جلوۂ توحید کو وہ برقِ جولاں کر | کہ خرمن پھونک دیوے ہستیٔ اہلِ ضلالت کا
مرا جوہر ہو سراپا صفائے مہرِ پیغمبر | میرا حیرت زدہ دل آئینہ خانہ ہو سنت کا
مجھے وہ تیغ جوہر کر کہ میرے نام سے خوں ہو | دلِ مہ پارہ اصحابِ نفاق و اہلِ بدعت کا
خدایا لشکرِ اسلام تک پہنچا کہ آ پہنچے | لبوں پر دم بنا ہے جوشِ خوں شوقِ شہادت کا
نہ رکھ بیگانہ مہرِ امام اتقیا سنت | کہ انکارِ آشنائی کفر ہے اس کی امامت کا
امیرِ لشکرِ اسلام کا محکوم ہوں یعنے | ارادہ ہے مرا فوجِ ملائک پر حکومت کا
زمانہ مہدیٔ موعود کا پایا اگر مومن | تو سب سے پہلے کہیو تو سلام پاک حضرت کا

اسی شوقِ شہادت میں ایک رباعی بھی کہی ہے ؎

مومن تمھیں کچھ بھی ہو جو پاس ایماں | ہے معرکۂ جہاد چل دیجیے وہاں
انصاف کرو خدا سے کرتے ہو عزیز | وہ جان جو کرتے تھے بتوں پر قرباں

ایک فارسی قصیدے میں بھی عرفی سے ہم طرحی کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عیسائیوں کے مظالم کی فریاد کی ہے گو اس میں جہاد کا ذکر نہیں ہے مگر یہ بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے اور مومن کی نصاریٰ سے بیزاری کا ثبوت۔ قصیدہ یوں شروع ہوتا ہے ؎

اے جسم تو جان آفرینش | جان تو جہانِ آفرینش
اے خاتم انبیا بہ شہرت | منشور ۔ اماں آفرینش

اور ختم اس طرح ہوتا ہے ؎

ایں عیسویاں بلب رساند تم | جان من وجان آفرینش
گلزار کہ پائمال گردیم | زاسیمہ سران آفرینش
تا چند بخواب ناز باشی | فارغ زفغان آفرینش
مومن شدہ ہمزبان عرفی | از بہر اماں آفرینش
برخیز کہ شور کفر برخاست | اے فتنہ گراں آفرینش

اور ایک فارسی قصیدہ سید صاحب کی مدح میں کہا ہے جس کا مطلع ہے ؎

اے آفتاب روئے ترا شپر آفتاب | شپر زند بدور تو چشمک بر آفتاب

ایک اور مدحیہ قصیدے کا مطلع ہے جو سید صاحب ہی کی شان میں کہا گیا ہے ؎

ز سرفرازیٔ ایں پست طالعی فریاد | کہ گر بود ز نتادن نمی رسد برباد

یہ دونوں قصیدے نہایت ہی بلند اور پرجوش ہیں۔

مومن نہ صرف جماعت مجاہدین کے پبلسٹی آفیسر تھے بلکہ پرجوش کارکن اور پکے مجاہد بھی بنے ہوئے تھے۔

مولوی زین خاں کوئی شخص مجاہدین کے ساتھ جہاد پر گئے مگر راستے میں نہ معلوم ساتھیوں کی بدسلوکی کی وجہ سے یا شاہ اسمٰعیل کی سختی کی وجہ سے خفا ہو کر وہاں کوئی فتنہ کھڑا کیا اور پھر واپس آگئے' اس پر بگڑ کر مومن نے ان کی خبر لی ہے۔

مومن ہجو نہیں کہتے تھے یا کہہ نہ سکتے تھے اس لئے اس قطعہ پر اکتفا کیا ہے ورنہ انھیں غصہ اس قدر تھا کہ کہہ سکتے تو ہجو کہنے میں بھی دریغ نہ کرتے ؎

مولوی زین خاں کہ با ہمہ علم | حالش از سگ خراب تر باشد
از شیاطین بود بہ خبثِ نہاں | گر بصورت ہمہ بشر باشد
رفت چندے بہ فوج دیں جا کرد | تا ز صدقش بدل اثر باشد
آخر کار فتنہ ہا انگیخت | آفریں فتنہ ایں قدر باشد
تہمتے بست بہ امیر کریم | باشد ایں عیبہا ہنر باشد
دشمن دوستانِ حق گردید | کین او مطفے شرر باشد
میزند طعنہ بر ملک روشاں | نطق گوز شتر اگر باشد
پوست برگندہ گفت طبع ہست | راز دانے کہ پردہ در باشد
خر عُش خواندم و جحلم | کہ ز دجال ہم بتر باشد
کشف سعدی یقین توانی کرد | گر ز اہل دلت خبر باشد
سال تاریخ باز گشتن او | چو بیاید ہنوز خر باشد

۶ مئی سنہ ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ کے میدان میں شاہ اسمٰعیل اور سید احمد شہید ہوگئے اور اس کی اطلاع دہلی پہنچی تو ابتدا دہلی والوں نے یقین ہی نہیں کیا اس کے بعد اواخر ماہ رجب میں کوئی قاصد دہلی پہونچا اور اس نے اطلاع دی کہ شاہ صاحب کی شہادت تو مسلم ہے مگر سید صاحب کی شہادت ثابت نہ ہو سکی کیونکہ ان کی نعش نہیں ملی تو عام خیال یہی ہوا کہ سید صاحب شہید نہیں ہوئے بلکہ لڑتے بھڑتے کسی طرف کو نکل گئے ہوں گے چنانچہ اسی خیال سے خوش ہو کر مومن نے یہ عجیب و غریب تاریخ کہی ہے ؎

زہے کسار آمد بہ سلخ رجب | زہے روزگار سعادت قریں
رسولے چو ابر کرم قطرہ زن | رسولے چو باد بہار آفریں
بہ فیض بشارات بلبل نوا | ز تاثیر نشگفتگی گل چیں
کلامش چو مرغ چمن جاں نواز | خرامش چو کبک دری دل نشیں

بلب مژدهٔ زندگی بخش دل | بدم چاره فرمائے جان حزیں
بلب نامهٔ جان فزائے کزاں | حیات امام جہاں شد یقیں
کریم و نشان نبیؑ که بہم | امین و سمیٔ رسول امیں
کشاید جہاں چو به بند و کمر | به بند و عدو چوں کشاید کمیں
زجولاں اسپش بمیدان جنگ | چو گردوں به جنبش درآید زمیں
به ایں نام نیکے برایں دست زور | کند ہفت اقلیم زیر نگیں
نیازش نه لشکر نه حاجت بزر | خدا ناصر است و پیمبر معیں
چو از بہر تاریخ فکر بلند | برآمد فراز سپہر بریں
شنیدم باآخر مه وسط سال | از اسرار داں بشر المومنیں
ہم از صرف اعداد اعداد حرف | چو کردم شمار شہور و سنیں
بمطلب رسیدم که در فن شعر | چنانم که کمتر بود ایں چنیں
بریدم سر طاغی و حاسدش | زہ حرف ملفوظی ابیات ایں
سخن سنجم و نیز مومن یکست | به سحر حلال من اعجاز دیں
ہر آنکس که ایں قطعه خوش نکرد | خود از نسل شیطاں بود آں لعیں
که قدسم فرستاد ہمدرہ درود | ملک گفت بر من ہزار آفریں

چونکہ مومن سید صاحب کی زندگی کی بشارت میں مگن رہے اس لئے انہوں نے شاہ اسمٰعیل کی شہادت کی تاریخ لکھی ہے یا لکھی بھی ہو تو دیوان میں جگہ نہ پا سکی کیونکہ مومن کی بہت سی تاریخیں مجھے ایسی بھی ملی ہیں جو دیوان میں نہیں ہیں

اس حادثہ بالاکوٹ اور مجاہدین کی شکست کا مضحکہ شاہ نصیر نے بھی اڑایا کیونکہ وہ مخالف تھے، چنانچہ ان کی اسی یاوہ گوئی کی وجہ سے شاہ صاحب کے حمایتی ان پر چڑھ دوڑے اور انھیں گھر سے نکال کر ان کے ساتھ بدسلوکی شروع کی گئی تھی کہ مرزا خانی کوتوال دہلی پہنچ گئے اور

انہوں نے بیچ بچاؤ کر دیا اور شاہ نصیر بال بال بچ گئے ورنہ بقول خود انھیں طوس کا راستہ لینا پڑتا، مگر مومن نے پھر بھی شاہ نصیر کا احترام کیا اور ان کے خلاف کچھ نہیں کہا ورنہ ممکن تھا کہ ان کے پٹنے کی تاریخ نکال دیتے۔

مدت تک عام خیال یہی رہا کہ سید صاحب کسی محفوظ جگہ ہیں پھر خروج کریں گے مگر بعد میں جب ساری تفصیلات معلوم ہوئیں تو سب رو پیٹ کر بیٹھ گئے مگر پٹنہ اور بنگال میں ایک جماعت نے انھیں مہدی ماننا شروع کر دیا اور بعض مریدین نے چالیس حدیثیں بھی جمع کر لیں جن سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ سید صاحب مہدی تھے وہ شہید نہیں ہوئے بلکہ غائب ہو گئے ہیں اس لئے یہ لوگ ان کے منتظر ہیں[۵۱]۔

سید صاحب کا خروج دراصل تحریک ولی اللہی کی تکمیل اور شاہ عبدالعزیز کی مساعیٔ جمیلہ کا نتیجہ تھا کیونکہ یہ سب شاہ صاحب ہی کی تیاریاں تھیں انہوں نے ہی شاہ اسمٰعیل کو تیار کیا تھا، اور سید صاحب کو امیر جماعت بنا کر بیعت جہاد کی اجازت دی تھی اور پھر شاہ اسحٰق کو اس تحریک کے آگے بڑھانے کی تلقین فرما کر وصال فرمایا تھا، چنانچہ جب ابتدائی دوروں کیلئے سید صاحب روانہ ہوئے تو شاہ صاحب نے اپنا ملبوس خاص عنایت فرما کر خدا حافظ کہا تھا اور مالی سرپرستی بھی فرماتے رہے، چنانچہ آخر تک مجاہدین کے پورے اخراجات شاہ اسحٰق ہی اٹھاتے رہے اور دہلی سے رقم اور رسد بھجوائی جاتی رہی۔

اس تحریک کے ختم ہونے اور مجاہدین کی ہزیمت کا افسوس ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جس طرح اس تحریک کو چلایا گیا وہ طریقہ ہی کامیاب نہ تھا، شاہ صاحبان اللہ والے لوگ تھے ان کا کام وعظ فرما دینا اور دلوں کو گرما کر عوام کو ایک راستے پر لگا دینا تھا جسے انہوں نے بڑی عمدگی سے کیا اگر شاہ اسمٰعیل اور سید احمد صاحب ان لوگوں سے سخت محنت لیتا اور

---

۵۱ تواریخ عجیب موسوم بہ سوانح احمدی، حجج الکرامہ۔

ایک جابر کمانڈر کی طرح ان سے کام لینا چاہتے تھے انھیں اس کا احساس نہ تھا کہ یہ مجاہدین نفط وقتی جوش میں ساتھ ہو گئے ہیں کیونکہ یہ نمازیان دین دار اور مجاہدین تہور شعار فقط تہان سرخ رو تھے' چنانچہ ان لوگوں نے ہر جگہ جان چھپائی شروع کر دی اور مختلف جھگڑے فساد بپا کر دیئے کبھی تو آپس میں لڑنے لگتے کبھی سرحدیوں سے لڑ پڑتے کبھی سکھوں سے مل جاتے چنانچہ سید صاحب کی طرف سے جعلی خطوط بھجوا کر مخلص مجاہدین کو مورچوں سے بلوایا اور راستوں میں مولوی مظہر اور حاجی بہادر خاں وغیرہ جیسے شریف اور نیک لوگوں کو شہید کرا دیا۔ انتہا یہ کہ خود شاہ اسمٰعیل اور سید صاحب کو ایسا پھنسا دیا کہ دونوں نے یہ طے کر لیا کہ ان منافقین کو انہی کے حال پر چھوڑ کر راج دلاری پہنچ جائیں گے مگر انھیں جانے بھی نہ دیا اور راستہ ہی میں شہید کرا دیا' اس طرح اس بہترین تحریک کا جو سالہا سال کی کوشش اور محنت کا نتیجہ تھی اسی بری طرح خاتمہ ہو گیا۔

افسوس ہے کہ میں اس تحریک سے متعلق تفصیلی رائے ظاہر نہیں کر سکتا کیونکہ یہ میرے موضوع سے الگ چیز ہے' جن حضرات کو اس سے دلچسپی ہو وہ غلام رسول مہر کی کتاب سید احمد شہید اور مجاہدین اسلام وغیرہ مطالعہ کریں۔

شاہ اسحٰق نے ناامید ہو کر اس تحریک کا رخ بدل دیا اور حنفی مذہب کی پابندی ترکی سلطنت سے اتصال اور عربی تعلیم کی ضرورت کی حد تک اُسے محدود کر دیا' چنانچہ انہوں نے یہ تعلیمی تحریک مولوی مملوک علی کو سونپ کر ہجرت کی اور مولوی مملوک علی نے عربی مدارس کے قیام سے اس کو دوبارہ شروع کیا اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن مغفور نے اُسے اور آگے بڑھایا جو اب تک جاری ہے'

مومن کا مذہب

حنفیوں نے مومن کو اہل حدیث اور وہابی کہہ کر بدنام کیا تو شیعوں نے خارجی کہنے سے بھی اجتناب نہیں کیا اس طرح مومن کو مطعون کیا گیا' عوام کا ذکر ہی کیا خواص بھی ان کو وہابی

سمجھتے رہے چنانچہ وہ بزرگ جو شاہ ولی اللہ کے خاندان اور ان کے عقائد سے واقف اور سید احمد بریلوی کے طریقۂ محمدیہ کے جاننے والے تھے انہوں نے بھی مومن کو وہابی ہی کہا ہے۔ چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی نے ایک دفعہ مجھ سے فرمایا کہ وہابیوں میں سوا مومن کے کوئی شاعر پیدا نہیں ہوا' بارگاہ سلیمانی سے وہابیت کا فیصلہ صادر ہونے کے بعد میں نے بھی مومن کو وہابی ہی سمجھ لیا چنانچہ ایک دفعہ مولانا عبداللہ عمادی کے سامنے میں نے مومن کی وہابیت کے متعلق کچھ کہا تو انہوں نے فرمایا کہ مومن وہابی نہ تھے بلکہ محمدی تھے'

مجھے مذہبی اختلاف کی بنا پر کسی سے نفرت یا محبت نہیں رہی ہے کیونکہ میں مذہب کو بالکل ذاتی چیز سمجھتا ہوں' اس کی بنا پر کسی سے دوستی یا دشمنی رکھنا فضول سی بات ہے چنانچہ غالب کی شیعیت کی وجہ میں متاثر ہوا اور نہ مومن کی وہابیت کی وجہ سے' مگر اب مجھے اس کتاب کے سلسلہ میں مومن کے مذہب پر غور کرنا پڑا تو عجیب و غریب باتیں نظر آئیں' مومن کو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی محبت تھی' یہ محبت اور عقیدت ان کے قصائد سے ظاہر ہوتی ہے' ایک قصیدے میں اس طرح گریز کرتے ہیں ؎

نہ مال دارم و نے حکمت مگر دارم	ہمیں متاع کہ جاں است و آں امید دار
نمی دہم بتو آں را کہ خواہم افشاندن	بجائے گل بسر خاک آں خجستہ مزار
کہ خاک روبۂ او صد ہزار جاں دارد	شدند تا ہمہ روحانیاں خلد نثار
چو سبزہ و چمن و لالہ روید از وی جاں	ز آب اشک کہ افتد ز دیدۂ بیدار

مزار مبارک کی تعریف میں سوہا شعر کہہ کر کہا ہے ؎

مزار کیست تو نہ میدی ای فلک یا نی	مزار آنکہ بود سر قبیلۂ اخیار
کدام آنکہ زبس برد نام نیکویش	ہزار جاں برم اینک برائے لب ایثار
محمد عربی جان حسن و روح جمال	دل محبت و دلدار ایزد غفار

— — — — — — — — — — — — — —

ترحمے بکن او زیک۔ یا رسول اللہ
نیم از آں تو آخر نمی پسندم خوار

ایک اور فارسی قصیدے میں کہا ہے ؎

ایں عیسویاں بلب رسانند
جان من و جان آفرینش

گلزار کہ پائمال گردیم
زاسیمہ سران آفرینش

اور دو فارسی قصیدے بھی اسی طرح حُبِ نبی میں ڈوبے ہوئے ہیں پھر غزلیات شروع ہوتی ہیں تو اس طرح ؎

زاعجاز تاثیر سخن گردیدہ است ایماں ما
وردِ زبان دیریاں بسم اللہ دیوان ما

لختے نصیب کس نشد از ہرچہ مارا دادہ اند
با خوان کولیں سخن حسرت خورد مہمان ما

دارم سر و برگ سخن با علم و دانش کار نیست
امی بود پیغمبرم افصح بود قرآن ما

روزے بہ یثرب می رسم سرمایہ بربادم مدہ
اے نالۂ جانسوز من اے آہ خون افشان ما

از جلالت سرکشی لختے فزوں تر کردہ ام
اے رحمۃ اللعالمین اے شافع عصیان ما

اردو قصائد بھی عشق نبی سے معمور نظر آتے ہیں چنانچہ ایک قصیدہ میں کہا ہے ؎

اگر کہے مدد اے یا محمد عربی
صفیر مرگ ہو رستم کو نعرۂ لاکوس

مخالفوں کو ترے دو جہاں جہنم ہے
کہ تاب مہر سے جلتے رہے ہیں یاں بھی مجوس

براق اسپ ترا ابر دے فرشتہ رکاب
کہاں ہو چشم بشر ایسے پاؤں لے محسوس

نہ جس کے دھیان میں مضمون قاب قوسین آئے
وہ دیکھ لے ترے تیر و کمان کا قربوس

ترے عدو کی خرابی کا کچھ علاج نہیں
نہ ہو قبول دعا سے بھی رفعت بسعوس

ترے خیال سے اصحاب کہف کو ہے یہ چین
وگر نہ خواب کہاں ورزمان دقیانوس

جب نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کو حج و زیارت کے لئے تیار ہوتے دیکھتے ہیں تو مومن بے چین ہوکر کہتے ہیں ؎

اے کہ بہ یثرب گذرے میکنی
رہبری و خوش سفرے میکنی

خاک براہ تو مباد بلند
خاد بپایت نہ رساند گزند

بخت رسا ہمرہ دہ یارت شود کام رساں حامی کارت شود
فتنہ گریزد ز سر راہ تو ترک فلک رہزن بدخواہ تو
زود بر کام روائے رسی کام روائی و بجائے رسی
تا بدر راہ برے رہ بری سجدہ زدرگاہ شہنشہ بری
ہم زگدا پیشہ حسرت خوری ولولۂ بر سر رحم آوری
شاد شوی نیز مرا شاد کن ہمدم و ہمراہ و ندیم توام

یہ اکتالیس شعر کی مناجات بڑی ہی پر درد اور والہانہ ہے، اس کے علاوہ بعض رباعیاں بھی کہی ہیں ؎

اے آنکہ سر مدینہ داری و حضور پیغام ادا کنی بر ستم دستور
جذبے گرے کہ مومن زار آخر تا چند سلامے بفرستد از دور

جب شیفتہ حج کرکے واپس ہوئے تو کہا ؎

داد دل حسرت زدہ ام داد خدائے نکشودہ گرہ ز کار یکشاد خدائے
بر من کہ فرشتہ بر نیاید ز سپہر از کعبہ ترا باز فرستاد خدائے

شیفتہ نے خاک طیبہ کا تحفہ دیا تو شیفتہ کے صدقے ہوکر مومن نے اپنی خوشی کا اظہار کیا ہے ؎

یار آمد و ارمغاں دلخواہ آمد مشت خاک در شہنشاہ آمد
گشتیم چناں زشوق برگرد سرش گوئی از مکہ کعبہ ہمرہ آمد
یار آمد و خوش ارمغاں آورد بدست بہر دل مردہ ہدیہ جاں آمد دست
مائیم و نگہ و حسرتی گردیدن خاک حرم خدائیگان آمد دست

مومن کو اپنی گنہگاری کے اعتراف کے ساتھ شفاعت نبوی پر پورا پورا بھروسہ بھی تھا ؎

آلودگیم بہر پیمبر شوید خاکم از رخ بآب کوثر شوید
غم نیست مرا ز لوث عصیاں دانم چنداں کہ بجس تنم مکرر شوید

مومن کا شوق حج اور اشتیاق زیارت نبوی آخر تک باقی رہا جب کبھی حاجی جاتے تو وہ روتے ؎

مومن کہ بجاں بیقراری ماندا ست — پا در گل و سر بزیر باری ماندا ست
نالہ بر حاجیاں کہ گویند از من — محروم بہند امیدواری ماندا ست

وہابی تحریک اور طریقۂ محمدیہ و طریق ولی اللہی میں بہت بڑا فرق ہے یار لوگوں نے جو اس طریقے کو وہابی مشہور کر دیا یہ بھی ایک کمال ہے۔ شاہ ولی اللہ نے زیر بحث مسائل کو کتاب وسنت کی کسوٹی پر پرکھ کر فقہا کے اقوال کو کتاب وسنت کی روشنی میں دیکھ کر جو اقوال یا مسائل اپنی کسوٹی پر پورے اترے انھیں کو قبول کر لیا اور دوسروں کو رد کر دیا تھا۔ شاہ اسمٰعیل شہید نے اسی پر عمل کیا اور سید احمد بریلوی بھی اسی پر چلتے رہے یہ سب پورے اور پکے حنفی تھے، اور یہی شاہ راہ طریقت ہے، البتہ شاہ اسمٰعیل نے بہت سی مردہ سنتوں کو زندہ کیا، اور بہت سے شرکوں اور بدعتوں کو مٹایا، ایسے شخص کو عبدالوہاب نجدی کا پیرو بتانا اور وہابی کہنا یقیناً ظلم ہے اس تحریک کا کوئی تعلق نجد یا صاحب نجد سے نہ تھا بلکہ بیشتر امور میں عبدالوہاب نجدی سے اختلاف تھا، چنانچہ ایک اہم مسئلہ توسل فی الدعاء کا تھا، شاہ اسمٰعیل توسل فی الدعاء کو جائز قرار دیتے اور شرک اصغر کے مرتکب کو کافر نہ کہتے تھے، بلکہ غیر مغفور خیال کرتے تھے اسی طرح اور مسائل میں بھی اختلاف تھا،

توسل فی الدعاء سے مراد یہ ہے کہ خداوند تعالےٰ سے استدعا ہے کہ جائے تو بحرمت فلاں یا بحق فلاں کہہ کر توسل اختیار کیا جائے، جو شاہ اسمٰعیل اور خاندانِ ولی اللہی کے پاس جائز تھا، چنانچہ مومن نے اپنے نعتیہ قصیدے میں اسی طرح توسل اختیار کیا ہے ؎

بصدق حضرت صدیق رضؓ آسماں پایہ — مصاحب تو شریک تو در مصائب غار
بنصفت عمرؓ و شرمگیِ عثمانؓ — بقوتِ اسد اللہ حیدر کرارؓ
بہ پاکدامنیِ فاطمہؓ بخلق حسنؓ — بخونِ ناحق غمگین حسینؓ بیکس و یار
بنہ امام دگر تاج تارک عالم — بدہ صحابہ کہ باشند افضل ابرار

شاہ ولی اللہؒ نے امام ابوحنیفہؒ سے علیحدگی اختیار کی ہے اور نہ شاہ اسمٰعیل نے بلکہ ان دونوں نے امام صاحب کی پیروی کی ہے اور اپنے آپ کو شرک و بدعت سے بچایا ہے البتہ مسائل مشتبہ میں انھوں نے سختی ضرور برتی ہے اور امام حنیفہؒ کے فتووں کو کھینچ تان کر اپنے مسلک پر ڈھالنے کی کوشش کے بجائے اس پر صحیح صحیح عمل کیا ہے البتہ بعض امور میں مثلاً تصور شیخ وغیرہ سے متعلق سید احمد کو جو اختلاف تھا وہ ان کا تقوی تھا فتوی نہ تھا اس ذاتی فعل کو طریق ولی اللہی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔

چونکہ فضل حق اور بعض دوسرے حضرات جو امام ابوحنیفہؒ کے فتووں کو کھینچ تان کر اتنی دور لیجاتے تھے کہ بدعت کی سرحد شروع ہو جاتی تھی تو ان سے مومن کو شدید اختلاف تھا اور یہ بحث مباحثے فضل حق اور مومن میں ہوتے رہتے تھے ان ہی اوقات میں بگڑ کر مومن نے کہا ہوگا ؎

یہ کچھ رہ سنت نہ طریق توحید	پھر کیا ہے ضرور سب کی یکساں تمہید
ہم سمجھے ہیں معنیٔ حقیقی یعنی	حیواں ہیں حقیقت میں یہ اہل تقلید

اہل تقلید سے مراد وہی بدعتی تھے جو شاہ اسمٰعیل اور سید صاحب کی مخالفت کرتے رہتے تھے اور خود یہ لوگ سید صاحب کو بدعتی اور جہاد کو خلاف سنت بتاتے تھے چنانچہ انہی کا ذکر مومن نے اس رباعی میں کیا ہے ؎

یہ چند منافق سراپا بدعت	ہے کفر و ضلال و فسق جن کی طینت
بتلاتے ہیں بدعتی امام حق کو	گویا کہ جہاد ہے خلاف سنت

اس طرح فضل حق اور ان کے ساتھیوں نے مومن کو وہابی اور اہل حدیث اور منکر ائمہ اربعہ کہنا شروع کیا تو مومن نے بھی بگڑ کر کہا ہاں جب نہ تھا تو اب ہوں ؎

ارباب حدیث کا میں فرماں بر ہوں	تقلید کے منکروں کا سر دفتر ہوں
مقبول روایت ائمہ نہ قیاس	یعنے کہ فقط مطیع پیغمبر ہوں

خالص ہوں محمدی مرا دین اسلام　　　گو رائے ثواب ہو نہیں مجھ کو کام
تقلید کی ٹھیری تو بنوں گا شیعہ　　　کس واسطے چھوڑ دیجیے افضل تر امام

غور فرمائیے محض اس جلن میں کہ مقلد بننا پڑے گا شیعہ ہونے تیار ہیں بھلا ایسا شخص کتنا محرور المزاج اور جذباتی نہ ہوگا؟ اِسی غصے میں انہوں نے یہ رباعی بھی کہی ہے ؎

ہر چند نہیں قیاس سے کچھ سروکار　　　پر توبہ سے از بسکہ ہوا ہیں بیمار
مئے بہر دوا پینے کو مفتی کے حضور　　　تقلید ابو حنیفہؒ کا ہے اقرار

البتہ وہ توحید وجودی کے قائل نہ تھے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ توحید وجودی مغالطہ منطقی بھی ہے ؎

مومن یہ اثر سیاہ مستی کا نہ ہو　　　اندیشہ کہیں بلند و پستی کا نہ ہو
توحید وجودی میں جو کیفیت ہے　　　ڈرتا ہوں کہ حیلہ خود پرستی کا نہ ہو

اس کی وضاحت اور ایک رباعی میں اس طرح کی ہے ؎

مومن ہے اگرچہ سب اسی کا یہ ظہور　　　توحید وجودی کا نہ کرنا مذکور
یعنے کے بنائے ہیں خدا نے بندے　　　بندے کو خدا بنائے کس کا مقدور

مومن کے وہابی نہ ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ عاشق اہل بیت سے تھے ؎

درد شہدائے کربلا تو دیکھو　　　خوں ریزی چشم ماجرا تو دیکھو
ایسوں سے ہو کیوں نہ حق تعالیٰ راضی　　　کیا صبر کیا ان کی رضا تو دیکھو

روتا ہوں حسینؑ ابن علیؑ کے غم میں　　　ہیں عیش جناں کے آنکھ اس ماتم میں
حیف آل نبی میں کوئی باقی نہ رہا　　　لازم ہے کہ باقی نہ رہے کچھ ہم میں

روشن ہے جو ہے آل عبا کا پایا　　　ہاں مرتبہ تسلیم و رضا کا پایا
قندیل ہے عرش کی جو ہر جا شہید　　　کیا ہووے گا شاہ شہدا کا پایا

ہنگامۂ حشر جبکہ برپا ہوگا
یوں روئے رسول سوئے اعدا ہوگا
اولادِ نبی پہ ظلم کیا کیا نہ کئے
سمجھے نہ یہ تم کہ ہم پہ کیا کیا ہوگا

مومن کو حبِ علی اسقدر تھا کہ بغضِ یزیدان کی بات بات سے ظاہر ہوتا ہے ؎

مردک نے شہنشاہ سے بیعت چاہی
گمراہ نے کس راہ سے بیعت چاہی
مصداق ہوا معنئ تبت کا یزید
فرزندِ یداللہ سے بیعت چاہی

شاید عام لوگ اس سے ناواقف ہوں کہ وہابی یزید کو برا نہیں کہتے اور نہ اس کے متعلق برا بھلا کہنا اچھا سمجھتے ہیں، اور پھر وہ سرے سے حضرت امام کی شہادت ہی کے منکر ہیں وہ قتل ایک معمولی قتل تصور کرتے ہیں ایسی صورت میں مومن کس طرح وہابی کہلا سکتے ہیں، جب کہ ان شیعی اور سنی روایتوں کو جو کربلا سے متعلق مشہور ہیں، مومن بڑے ہی وثوق سے بیان کرتے ہیں ؎

امواج فرات دیکھ روئے شبیرؑ
حسرت سے یہ خوں نابہ فشاں کی تقریر
ہیں اپنے ہی اتنی لہو کے پیاسے
کیا تشنگی آلِ نبی کی تدبیر

ایک رباعی تو بڑے غضب کی لکھی ہے ؎

تابندگی تمدار سے فرقِ امام
تھا جلوہ تماشائی سے جوں ماہِ تمام
یہ حجت ساطع کراماتِ حسینؓ
افزوں ہوئی تیرہ روزئ لشکرِ شام

مومن کو فضلِ حق وغیرہ غیر مقلد کہتے تھے اس لیے مومن فضل حق اور ان کے ساتھیوں کو مقلد کہتے تھے چنانچہ ایک رباعی میں تو انھیں قاتلانِ حسینؓ سے ملا دیا ہے ؎

کیا سخت تھے ابن سعد و ابن زیاد
اولادِ نبی پہ ہے ستم یہ بیداد
فریادِ امام کی کسی نے نہ سنی
اللہ سنے مقلدوں کی فریاد

مومن جب اس پر غور کرتے تھے کہ ان کے مخالفین ان کے علم و فضل شعر و ادب کو چھوڑ کر صرف ان کے اعتقادات سے بحث کرتے رہتے ہیں اور نکتہ چینی کرتے ہیں تو بگڑ کر کہتے ہیں ؎

کی صرف کمال زندگانی ہم نے | دیکھا نہ جہاں میں قدر دانی ہم نے
افسوس ہے ایسے بے تمیزوں سے گلہ | قدر اپنی کچھ آپ ہی نہ جانی ہم نے

بہر حال مومن ایک پکے مسلمان، طریقۂ محمدی کے پیرو، عاشق رسول، محب اہل بیت اطہار و مخلص صحابۂ کبار تھے، مومن نے صحابہ کرام کی مدح میں بھی قصائد کہے ہیں جو ان کے وہابی نہ ہونے کی دلیل ہے ورنہ مدح صحابہ تو رہی ایک طرف مدح رسول کے روادار بھی وہابی نہیں ہوتے

باوجود ان سب باتوں کے مومن وسیع المشرب تھے، ان کے دوستوں میں شیعہ، سنی، ہندو، سبھی شریک تھے، اور وہ ان سب سے گھل مل کر رہتے اور ان کے مذہبی جلسوں میں بھی نہ صرف شریک ہوتے بلکہ دلچسپی بھی لیتے تھے

چنانچہ اشرف الدولہ کی ضریح اور امام باڑے کی تاریخ اس سے پہلے نقل کی جا چکی ہے انتہا یہ کہ ان کے کسی ہندو دوست نے جو غالباً کائستھ تھے بھٹی لگائی تو مومن نے تاریخ کہی ہے، غور فرمائیے کوئی پابند مذہب مسلمان شراب خانہ کی تاریخ کہہ سکتا ہے؟ ایسے کافر کو کون مومن سمجھے!

خوش وقت رائے میکدہ نو بنا نہاد | خوش وقت میکشان پزندان شوق امیر
شیراز مست شوق تماشا روانہ شد | بر بوئے بادہ جانب این قصر بے نظیر
مست طرب فتادہ و پیالہ دادہ محتسب | برخاکہ بہ اشتیاق نگارین دلپذیر
من از خمار حسرت تاریخ یابگی | اندیشہ رقص ہا زدہ مستانہ در خمیر
حیران ستادہ دیدہ و مرا پیر می فروش | گفتا کہ فکر چیست زخمخانہ مے بگیر

۱۲۹۶ — ۵۰
۱۲۴۶ھ

مومن باوجود پیروں اور مشائخوں کے مخالف شاہ اسمٰعیل کے پیرو اور سید احمد بریلوی کے مرید ہونے کے مشائخ دوست تھے، چنانچہ میاں کالے جن کے مکان میں مرزا غالب مدتوں رہے ہیں نے وصال فرمایا تو انہوں نے تاریخ کہی ہے

ہوئی جس دم وفات حضرت کی — مجھ کو تاریخ کا خیال آیا
ہاتف غیب نے کہا ناگاہ — کالے صاحب کو سرخ رو پایا

میں نے جہاں تک غور کیا ہے، مومن بہت اونچی سطح کے آدمی تھے، اُن کی مجلسی حیثیت بہت بلند تھی، وہ اپنے آپ کو شیعہ، سنی، حنفی، وہابی کسی جماعت سے منسلک کرنا نہیں چاہتے تھے مگر اُن میں ایک سچائی تھی ایک صداقت تھی ان کی فطرت کج روی کو پسند نہیں کرتی تھی اس لئے وہ ہر چیز کو صحیح روشنی میں دیکھنا چاہتے تھے ان کی تربیت چونکہ شاہ صاحبان کے پاس ہوئی تھی اس لئے اُن میں ایک رکھ رکھاؤ ایک وقار اور ایک صداقت تھی۔

مومن میں یہ کمزوری ضرور تھی کہ وہ عاشق مزاج تھے لہو و لعب میں مبتلا تھے مگر باوجود اس کے بقول آزاد "نیک خیالوں سے خالی" بھی نہ تھے بلکہ اپنی کمزوری کو کمزوری اور اپنے گناہ کو گناہ سمجھتے تھے، جھوٹی سچی تاویل اپنے افعال کی کرتے نہ تھے، بخلاف اُن کے فضل حق بھی انھیں کی طرح مبتلائے فسق و فجور تھے۔ علانیہ رنڈی کو سامنے بٹھا کر طلبار کو درس دیا کرتے تھے، اور اپنے اعمال کو سراہتے بھی تھے، یہی باتیں دونوں میں بحث و مباحثہ، جدل و مناظرہ کا باعث تھیں فضل حق مومن کو خواہ مخواہ چھیڑتے اور مومن بگڑ کر کچھ نہ کچھ کہتے رہتے، انہوں نے نثر میں جو کچھ کہا وہ محفوظ نہ رہ سکا۔ مگر ان کی رباعیاں محفوظ رہ گئیں۔

یہ چند رباعیاں جو بنائے فساد ہیں عبدالرحمن آہی کی غلطی سے شریک دیوان ہو گئی ہیں، اس قسم کے شعر بطور تفنن سبھی کہتے ہیں میر، سودا، ناسخ، آتش اور غالب سبھوں نے کہا ہے۔ چنانچہ بعضوں کے یہ شعر شریک دیوان بھی ہو گئے ہیں، غالب نے بھی ایسے شعر بہت سے کہے ہیں۔ مگر انھیں دیوان میں جگہ نہیں دی، اگر مومن اپنا دیوان آپ مرتب کرتے تو یقیناً ان رباعیوں کو شریک نہ کرتے مگر عبدالرحمن آہی ناتجربہ کار تھے استاد پرستی کے جذبے کے تحت انہوں نے ان اشعار کو شریک دیوان کر دیا ہے۔ مومن زخمی اور بستر مرگ پر دراز تھے اتنی سکت انھیں نہ تھی کہ ان باتوں پر غور کر سکتے۔ حکیم احسن اللہ خاں اور نواب مصطفیٰ خاں کی نظر سے شاید یہ آخری مرتبہ یہ دیوان مومن

نہیں گزرا ورنہ یہ لوگ ان رباعیوں کو یقیناً نکال دیتے' چنانچہ حکیم احسن اللہ خاں نے فارسی دیوان مومن سے اس قسم کی رباعیات اور بعض ایسی تاریخیں جو ناقابلِ اشاعت تھیں نکال دیا تھا' رامپور کے بعض قلمی دیوان مومن (فارسی) میں اس طرح کے تاریخی قطعات موجود ہیں جنھیں حکیم احسن اللہ خاں نے مطبوعہ دیوان میں جگہ نہیں دی ہے۔

ایسی چیزیں بالکل جذباتی اور وقتی ہوتی ہیں انھیں سوانحی مواد بنانا اور ان سے بحث کرنا فضول سی بات ہے۔ حال ہی میں جو دیوان غالب (عرشی اڈیشن) شائع ہوا ہے اس میں ایسی بیشتر چیزیں آئی ہیں جو مومن کی رباعیوں کی طرح وقتی اور تفننی تھیں' ایسا ہونا قدرتی بات ہے اور یہ چیزیں قابلِ گرفت نہیں ہیں'

شاہ اسمٰعیل اور ان کے پروپگنڈسٹ مومن کو لوگ اہلِ حدیث اور وہابی کیوں کہتے تھے اس کی وجہ محض اتنی ہی تھی کہ شاہ صاحب نے دہلی کی مذہبی حالت کی خرابی دیکھ کر جو کوشش تجدید ایمان کی کی' اور جس بے جگری سے وعظ کہہ کہہ کر دہلی کے عوام کو راہِ راست دکھائی وہ ان کے خلاف تھی اس کے جاننے کے لیے' آپ کو دہلی کی مذہبی حالت کا جائزہ لینا ہوگا۔

دہلی کی مذہبی حالت یوں تو شہنشاہ اکبر ہی کے زمانے سے خراب تھی خاندان شاہی اور امراء نے غیر مذہبی رسوم و بدعات کو جزو مذہب بنا لیا تھا مگر عالمگیر نے بڑی حد تک ان خرافات کی بیخ کنی کی تھی مگر سورما چاہار تھوڑا ہی جوڑ سکتا تھا؟ صرف بادشاہت کے اثر سے ایک خاص مدت تک ان بدعات اور منہیات کی روک تھام کی مگر ادھر عالمگیر کی آنکھ بند ہوئی اور ادھر پھر وہی دندنہ شروع ہو گیا۔

سیتلا ماتا کی پوجا' دسہرے کی پوجا' جشن نوروزی' کنگنا باندھنا' راکھی پونم میں راکھی باندھنا شروع ہو گیا' محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں تو مذہب کا مضحکہ کھلے بندوں اڑایا جانے لگا۔ خدا اور رسول کی توہین سربازار اور اندرون دربار ہونے لگی' قلعہ فسق و فجور کا مخزن بن گیا بھانڈوں اور مسخروں کے سوا دربار میں کوئی پڑھا لکھا نہ رہا' یہ تو مشہور بات ہے کہ

نادر شاہ کا مکتوب آیا تو اِدھر سے جواب لکھنے کے لیے تین سال تک یہ جھگڑا ہوتا رہا کہ نادر شاہ کو القاب کیا لکھا جائے۔

نام نہاد صوفیوں اور گمراہ کن پیرانِ طریقت کا عروج ہو گیا، انہوں نے کھلم کھلا امرد پرستی شروع کر دی، اسی ناپاک دور کی یادگار لغت میں "علمتِ مشایخہ" کے نام سے محفوظ ہے، ان نام نہاد صوفیوں نے دیوانِ حافظ کو الہامی کتاب بنا لیا، اور قرآن مجید کی جگہ یہی دیوان پڑھایا جاتا تھا، آخر انہی خرافات اور بدعات نے قہرِ الٰہی کو نادر شاہ کی شکل میں نازل کرا لیا،

اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں (گو وہ برائے نام وظیفہ خوار بادشاہ رہ گیا تھا مگر شہر دہلی پر اس کی حکومت باقی تھی) یہ حال تھا کہ شہزادوں نے جامع مسجد کو دیوان خانہ بنا رکھا تھا، نوروز کے دن جامع مسجد کی سیڑھیوں پر آتشبازی کے انڈے لڑائے جاتے تھے، اندرون مسجد جوا کھیلا جاتا تھا، جامع مسجد کے حوض کے اطراف خوانچے والے بیٹھا کرتے تھے، شہزادے اور امیر زادے ان ہی خوانچہ والوں سے دونے لے کر کھاتے اور خالی دونے مسجد میں پھینکتے جاتے تھے، قلعہ میں سورۂ یاسین کا نام شادی سورت رکھا گیا تھا کیونکہ سورۂ یاسین جان کندنی کے وقت پڑھی جاتی تھی (چونکہ اِن دنوں دلی میں ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی تھی اور ہر بیمار کے سرہانے یٰسین شریف پڑھی جاتی تھی اور ہیضے کو قلعہ کی بیگمات شادی بولتی تھیں، اس لیے) سورۂ یٰسین کا نام شادی سورت ہی رکھ دیا گیا۔

قلعہ کے شہزادے بٹیر بازی، مرغ بازی، پدی بازی وغیرہ میں مبتلا تھے، قرآن و حدیث تو ایک طرف، روزے نماز کا بھی کوسوں پتہ نہ تھا، ڈوم ڈھاڑیوں، سارنگیوں طبلیوں سے کام تھا، بیوی کی صحنک، شیخ صدو کا بکرا، سید احمد کبیر کی گائے، بڑے پیر کی گیارھویں کے نام سے دھوم دھام کے جلسے ہوتے، فاتحہ کا کھانا کھاتے ناچ رنگ اکل و شرب ہوتا رہتا۔

مشائخین نے عوام کو یہ باور کرا دیا تھا کہ قرآن شریف معنی سے پڑھنا گناہ ہے اور

اسے سمجھنا کفر ہے، چنانچہ شاہ ولی اللہ نے جب قرآن مجید کا ترجمہ کیا تو ملاؤں نے فتحپوری کی مسجد میں ہنگامۂ عظیم برپا کر دیا، کفر کے فتوے دیئے اور شاہ صاحب کی جان کے دشمن ہو گئے مسجد میں گھس کر انھیں قتل کرنا چاہا، شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر اعلان حق کی جرأت نہ کر سکتے تھے خود ان شاہ صاحبان کے گھروں میں بیوی کی صحنک ہوتی تھی اور یہ روک نہ سکتے تھے

قلعہ میں فخرالدین صاحب کی پوجا ہوتی تھی، یہ بزرگ ہاتھوں میں مہندی لگائے ملبی لمبی زلفیں عطر میں بسائے پور پور چھلّے پہنے نفیس گیروا لباس زیب تن کئے چلّے کی تھاپ پر گت ناچتے تھے بادشاہ معہ بیگمات اُن کے پاس آتا تھا قلعہ کی عورتیں اُن پر اور سب اُن کی اولاد پر حلال تھیں وہ ایک نگاہ کی محتاج رہتی تھیں۔[1]

اس شرمناک حالت کے خلاف بولنے کی ہمت کسی میں نہ تھی سب سے پہلے شاہ اسمٰعیل نے جان پر کھیل کر جامع مسجد میں جمعۃ الوداع کے روز پہلا وعظ کہا، اس وعظ میں انہوں نے وحدانیت اور سنت نبوی کی تعریف بیان کی اور بدعات کے خلاف اپنے خیالات ظاہر کئے "دہلی والوں کے کان اس آواز سے ناآشنا تھے۔ یہ آواز اُن کے لئے اجنبی تھی اس لئے ہزاروں آدمیوں نے وعظ سنا اور سینکڑوں نے مخالفت شروع کر دی، چند نیک دل لوگوں نے بڑھ کر بیعت بھی کی اور مخالفین نے طرح طرح سے شاہ صاحب کو بدنام کرنا شروع کر دیا مگر شاہ صاحب بھی بڑے ہی سخت آدمی تھے انہوں نے دوسرا وعظ فقیری کے متعلق کہا جو پہلے وعظ سے زیادہ تلخ تھا، اس پر سارے صوفی اور مشائخ اور نام نہاد فقرا جو اپنے آپ کو متوکل کہتے تھے، چراغ پا ہو گئے اور کھلی مخالفت کرنے لگے۔

شہر دہلی کا انتظام انگریزوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا، اس لئے مخندوں کو شاہ صاحب پر حملہ کرنے کا موقع نہ مل سکا، بلکہ انھوں نے آئینی کارروائی شروع کی اور ایک

---

[1] حیات طیبہ صہ۱۴

محضر شاہ صاحب کے خلاف مرتب کر کے پندرہ سو دستخطیں لیں اور رزیڈنٹ کے پاس بھیج کر دیا چنانچہ رزیڈنٹ نے شاہ صاحب کو وعظ کہنے کی ممانعت کر دی مگر شاہ صاحب بھی بلا کے سخت جان تھے انہوں نے ایک لمبی چوڑی چٹھی رزیڈنٹ کو لکھی اور رزیڈنٹ اُن سے ملاقات کر کے اسقدر متاثر ہوا کہ انھیں دوبارہ وعظ کہنے کی اجازت دیدی، اس طرح زبان بندی کے چالیسویں روز ہی لب کشائی کا حکم مل گیا اور شاہ صاحب نے وہ وہ دھواں دھار وعظ کہے کہ دھوم مچا دی ہزاروں مسلمان آپ کے وعظ کی برکت سے راہ راست پر آگئے اور ہزاروں نے آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور سینکڑوں طوائفیں پیشہ چھوڑ کر تائب ہوگئیں۔

تحریک ولی اللّٰہی کی کامیابی سید احمد بریلوی کی شہرت اور جماعت مجاہدین کی تنظیم یہ سب شاہ اسمٰعیل ہی کے مساعیٔ جمیلہ کا نتیجہ تھا، شاہ صاحب نے حقیقت یہ ہے کہ وہ کام کیا جو ایک مجدد ہی کر سکتا تھا ان سا مصلح پھر کوئی پیدا ہی نہیں ہوا، اُن میں ہمہ جہتی صلاحیتیں تھیں اور وہ جس کام کو ہاتھ میں لیتے بہ احسن الوجوہ پورا کرتے تھے، غدر سے پہلے جو اسلامی شان دلی میں جھلکنے لگی تھی وہ شاہ صاحب ہی کے مواعظ اور مساعی کا نتیجہ تھی۔

یہ کتنی بدنصیبی ہے کہ شروع ہی سے مسلمانوں نے اسلام کو نقصان پہونچایا ہے اور مسلمان ہی اسلامی تحریکوں کا گلا گھونٹتے رہے، چنانچہ یہاں بھی وہی ہوا، شاہ عبدالعزیز کے شاگرد فضل حق وغیرہ شاہ اسمٰعیل کے مخالف ہو گئے اور ان کی تحریک کو نقصان پہنچاتے رہے مگر شاہ اسمٰعیل نے اس مخالفت کی ذرہ برابر پروا نہیں کی اور اپنا کام کرتے رہے ان کا یہی اقدام اور یہی جذبہ انھیں کامیاب بناتا رہا۔

مومن شروع ہی سے شاہ اسمٰعیل کے ساتھ رہے اور فضل حق وغیرہ کا مقابلہ کرتے رہے اسی لئے بدعتیوں نے انھیں شاہ صاحب کا ساتھی وہابی اور اہلِ حدیث بتا کر مطعون کیا۔

مسلمانانِ ہند کا پہلا قومی شاعر

مومن مسلمانانِ ہند کے پہلے قومی شاعر ہیں ان سے پہلے کسی نے مذہبی آزادی اور

ملکی حالت کی طرف توجہ نہیں کی تھی' محمد اکرام نے اپنی کتاب موج کوثر میں لکھا ہے "حالی کو بالعموم مسلمانانِ ہند کا پہلا شاعر سمجھا جاتا ہے لیکن جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ مولانا سید احمد بریلوی نے پہلی دفعہ مسلمانان ہند کی جداگانہ قومیت کا اظہار سب سے پہلے کیا اور دوسری قوموں کے مقابلہ میں جمع کیا اور ان کے ایک طبقے کو مذہبی آزادی دلانے کیلئے اپنی جان قربان کر دیا تو یہ ماننا پڑے گا کہ مومن مسلمانان ہند کا پہلا قومی شاعر تھا اس نے سید احمد کے خیالات کی ترجمانی اسی طرح کی ہے جس طرح بعد میں سرسید کی حالی نے کی ہے"

سید صاحب کے مریدوں میں کئی بلند پایہ ہستیاں تھیں ان میں سے ایک قابل ذکر ہستی اردو کا مشہور شاعر مومن بھی ہے بعض لوگوں کو تعجب ہوگا کہ ایک حکیم نجومی' اور "تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" کے عاشقانہ گیت گانے والا کس طرح ان لوگوں میں شریک ہو سکتا ہے جنکی زندگیاں سادہ اور سپاہیانہ تھیں' امر واقعہ یہ ہے کہ مومن بھی اس انقلاب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا جو تمام ہندستان میں وقوع پذیر ہوا وہ حضرت مولانا سے دلی عقیدت رکھتا تھا[۱]

مومن کے سفر

شیفتہ نے گلشن بے خار میں لکھا ہے کہ "از روز ولادت الامال بہ سبب موافقت شاہ جہاں آباد اہل شاہ جہاں آباد بہ سمتے حرکت نکردہ"[۲] گلشن بے خار کی ترتیب شروع ہوئی ہے ۱۲۴۸ھ میں اور سن ۱۲۵۰ھ میں تذکرہ مکمل ہوا ہے' اس سے ثابت ہے کہ ۱۲۵۰ھ تک مومن نے دہلی سے باہر قدم نہیں رکھا تھا گویا پینتیس سال کی عمر تک مومن نے کوئی سفر نہیں کیا تھا'

محمد حسین آزاد نے آب حیات میں مومن کے چار سفر گنائے ہیں لکھا ہے کہ وہ "دلی امپور گئے دوسری دفعہ سہسوان"[۳] یہ صحیح نہیں ہے مومن پہلے سہسوان گئے ہیں اور اس کے بعد رامپور

---

[۱] موج کوثر ص ۲۳' ۲۵' [۲] گلشن بے خار ص ۱۹۶' [۳]: حیواۃ العلماء سہسوان ص ۳۰

کیونکہ سید عبدالباقی سہسوانی نے "حیواۃ العلماء سہسوان" میں حضرت تاج الدین حسن سہسوانی کے حالات میں لکھا ہے کہ جب سہسوان صدر ضلع تھا تو نواب محمد سعید خاں وہاں ڈپٹی کلکٹر تھے اور قاضی محلہ میں مقیم تھے۔

"مشہور شاعر مومن خاں دہلوی جب بغرض ملاقات نواب محمد سعید خاں بہادر وارد سہسوان ہوئے تو آپ (حضرت تاج الدین) کی خدمت میں معتقدانہ مستفیض ہوتے رہے۔"[1]

نواب محمد سعید خاں کی تخت نشینی ۱۲۵۶ھ میں ہوئی اور نواب صاحب تخت نشینی سے پہلے سہسوان میں ڈپٹی کلکٹر تھے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ مومن نے سہسوان کا سفر ۱۲۵۰ھ کے بعد اور ۱۲۵۶ھ سے پہلے کیا ہے اور یہ قطعہ ؎

صاحبو حال میرا مت پوچھو	بندۂ سخت بے وفا ہوں میں
چھوڑ دلی کو سہسوان آیا	ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں
عذر بیجا ہے سرکشی کے لئے	شاکیٔ بے سبب جفا ہوں میں
اک خداوند شوخ کے غم میں	قابلِ رحم ہو گیا ہوں میں
مجھ کو پہنچا دو میرے صاحب تک	اک غلام گریز پا ہوں میں

اسی سفر کی یادگار ہے، سہسوان میں عام شہرت یہی ہے کہ مومن کسی ڈومنی کے تعاقب میں وہاں پہنچے تھے، غالباً یہ شہرت مذکورۂ بالا قطعہ ہی کی وجہ سے ہوئی ہے کیونکہ انہوں نے "مجھ کو پہنچا دو میرے صاحب تک" کہا ہے اسی کو کسی نے صاحب جی سمجھا اور کسی نے ڈومنی خیال کیا، مگر یہ دونوں باتیں بھی بے اصل ہیں کیونکہ صاحب جی سہسوان میں نہیں تھی اور ڈومنی کے پیچھے مومن کا پھرنا کوئی سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔

---

[1] حیواۃ العلماء سہسوان ص ۳۰

غرض گیا دہی نے لکھا ہے کہ سہسوان میں اپنے ہمراز دوست حکیم مظہر علی کے یہاں کہ وہاں کے رئیس تھے تشریف لے گئے تھے[۱]۔ یہ خبر اس حد تک ضرور صحیح ہوگی کہ حکیم مظہر علی مومن کے دوست ہونگے مگر مومن کا سفر نواب محمد سعید خاں کی وجہ سے ہونا ثابت ہے۔

مومن نے ایک شعر کہا ہے ؎

بدایوں میں مجھے جوشِ جنوں لایا ہے دلی سے ؞ یہ کیونکر چارۂ پندِ خردمنداں کا ہوش آیا

اِس شعر کو پڑھ کر بعض لوگوں نے مومن کے دو سفر سہسوان کا الگ، اور بدایوں کا جدا قرار دیئے ہیں یہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ سید عبد الباقی نے صاف لکھا ہے کہ ضلع بدایوں کا صدر مقام سہسوان تھا، چونکہ ضلع بدایوں ہی میں سہسوان تھا، اسلئے مومن کا یہ سفر بدایوں ہی کا سفر کہلائے گا ممکن ہے کہ اسی سفر میں مومن نے مستقر بدایوں میں قیام کر کے سہسوان کا سفر کیا ہو یا سہسوان سے واپسی میں بدایوں میں قیام کیا ہو،

بہرحال یہ سہسوان اور بدایوں کے دو علٰحدہ علٰحدہ سفر نہیں بلکہ ایک ہی ہے،

اس کے بعد ۱۲۵۶ھ یا اس کے بعد مومن نے رام پور کا سفر کیا ہے کیونکہ اسی سال نواب سعید محمد خاں کی تخت نشینی ہوئی تھی، اِس سے پہلے مومن کے رامپور جانے کی کوئی وجہ نہیں تھی، یہ شعر اسی سفر کی یادگار ہے ؎

دلی سے رام پور میں لایا جنوں کا جوش ؞ ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم

آزاد نے تیسرا سفر جہانگیر آباد کا بتا کر لکھا ہے کہ وہاں کئی دفعہ گئے، اور چوتھے سفر کے متعلق لکھا ہے کہ نواب شائستہ خاں کے ساتھ سہارنپور گئے تھے پھر یہ رائے لکھی ہے کہ "اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دلی میں جو کچھ میسر تھا اسی پر قانع تھے"[۲]

ٹونک میں شہرت ہے کہ نواب ٹونک سے ملنے کے لئے بھی مومن ٹونک گئے تھے مگر اس کا کوئی ثبوت

---

[۱] حیات مومن ص ۵۸، [۲] آب حیات ص ۴۳۹

نہیں ملتا، وزیر الدولہ کی طلبی پر مومن کی حضرت خواہی ان اشعار سے ثابت ہے ؎

مجھ سے ناکس کی ہم نشینی کا — تجھ سے داور کو شوق پنہانی
- - - - - - - - - - - - - - - - -
پر کروں کیا کہ بن نہیں آتی — ورنہ میں اور تیری مہمانی
بعد چندے اگر خدا چاہا — میں ہوں اور تیرے در کی دربانی
آکے اس بزم میں دکھاؤں گا — شعلہ ہائے خرد کی نیرانی

دکن کے سفر کا ارادہ

مومن کے ایک چچا حکیم غلام حسین خاں حیدر آباد آگئے تھے اور یہاں ایک اچھے عہدے پر فائز تھے مومن ان سے مراسلت کرتے رہتے تھے چنانچہ انشائے مومن میں ایک رقعہ انکے نام بھی نظر آتا ہے

"درین دیار خراب کہ بدست کفر و جاہل بقید را فتادہ قدر شریف و نجیب حکم کیمیا گرفتہ و دولت و اقبال ترجمۂ عنقا شد لاجرم سفر لکھنؤ صوابدید خاطر است اگر دراں جا از رشتۂ مطلب گرہ کشودہ نیکو تر ورنہ عزم آں دیار ہم بدل می خلد کہ بسیار قدر دانی راجہ چندو لال بہادر نسبت بہ ارباب کمال و شعراء وانمودہ اند و ایں ہیچ مداں را بوئے از یں گلزار بہ باغ اندیشہ رسیدہ بالجملہ اگر خواستہ ......[1] بدولت قدم بوسی سرمایہ اندوزی شوم"[2]

اسی رقعہ میں مومن نے لکھا ہے کہ آپ کا التماس نامہ والد ماجد کے نام پہنچا جس کے دیکھنے سے آپکے ارادۂ حج بیت اللہ کا علم ہوا، پھر یہ بھی لکھا ہے کہ سولہ مہینے ہوئے کہ دادی نے انتقال کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط مومن نے اپنی دادی کے انتقال یعنی ۱۲۳۷ھ کے سولہ مہینے کے بعد ۱۲۳۸ھ یا ۱۲۳۹ھ میں لکھا ہے اور اُن کے والد کا انتقال ۱۲۴۱ھ میں ہوا ہے اس لئے یہ خط ۱۲۳۹ھ کے اواخر یا ۱۲۴۰ھ کے اوائل کا لکھا ہوا ہے۔

تاریخ گلزار آصفیہ میں حکمائے دولت آصفیہ کے حالات میں حکیم غلام حسین خاں کا حال بھی نظر آتا ہے

---

[1] یہاں کی عبارت اڑ گئی ہے۔ [2] انشائے مومن صفحہ ۱۲۵، ۱۲۶، رقعہ ۱۲

حکیم غلام حسین خاں شاہ جہاں آبادی

"از جملہ سر خیلانِ علمائے عصر و فضلائے روزگار فضیلت خان معز در یں عہد بیمثال است در معقول و منقول و دیگر علوم و فنون بحر مواج است کہ پایان ندارد قلم را طاقت تحریر و زبان را قوت تقریر فضائل و کمالات ایشان نیست ہمیں کلمہ بس است کہ مثل خود ندارد چون وارد ایں دیار دکن گردید راجہ گوبند بخش بہادر بکمال قدر دانی تا معمور بودن انتظام صوبۂ برار و اورنگ آباد و معاملات لشکر فیروزی سالہا بدر ماہہ پانصد روپیہ ہمراہ خود داشتہ قدر دانیہا و سلوکہا فرمودہ و بعد مراجعت از لشکر مہاراجہ چندو لعل بخدمت عدالت العالیہ از حضور پرنور سرفراز کنانیدہ معمور خدمت مذکور داشتہ اند کہ شبانہ روز در فیصلہ قضایائے ساکنان بلدۂ حیدرآباد از روئے احکام شرعی مصروف اند معہذا بذاتہ در مروت و آدمیت و قدر شناسی انسان و اہلِ کمال و سلوک با قربا و احبا و توجہ بحال غربا عدیم المثال و کریم الخصال و عمیم الاشفاق تواں گفت در حضور پرنور بمرتبۂ عزت و آبرو دارند و ہموارہ حاضر دربار فلک اقتدار اند دریں زماں کہ سنہ ۱۲۵۸ ہجریست احدی در دیار دکن بفضیلت و علمیت و کمالات علمی خان معز نمی رسد حال ہند منحصر بہ استحقاق است و بس"[۱]

حکیم غلام حسین خاں کا خاندان حیدرآباد ہی میں ہے۔ میرے خسر مولوی محمد بہار الدین مرحوم کے پاس ایک قلمی کتاب ان کے دادا مولوی کرامت علی دہلوی کی لکھی ہوئی تھی جس پر حاشیہ مولوی کرامت علی کے فرزند مولوی عنایت علی نے لکھا تھا۔ اس ہی کی سلسلہ میں حکیم غلام حسین خاں کے فرزند خلیل اللہ خاں میر عدل پرگنہ بھونگیر کا ذکر بھی موجود تھا۔ اس کے پڑھنے کے بعد میں نے مولوی بہار الدین سے اس خاندان کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے خلیل اللہ خاں کے بیٹوں

۱؎ تاریخ گلزار آصفیہ صفحہ ۴۴۴، ۴۴۵

پوتوں کے نام بھی بتائے تھے جو اب تک موجود تھے، افسوس ہے کہ یہ کتاب میرے برادر نسبتی سلطان محی الدین صاحب کے ساتھ تھی اس لئے پولس اکشن میں ضائع ہو گئی اور مولوی بہار الدین صاحب نے مجھے جو نام بتلائے تھے وہ یاد نہیں رہے اس لئے اب اس خاندان سے میں بالکل ناواقف ہوں اسی سلسلہ میں میں نے روزنامہ سیاست حیدرآباد دکن میں (جنوری سنہ ۱۹۶۶ء) اعلان بھی کیا کہ اس خاندان کے کوئی افراد باقی ہوں تو مجھ سے ربط پیدا کریں مگر کسی نے توجہ نہیں کی معلوم نہیں کہ اس خاندان کے افراد اب اپنے آباء اجداد سے واقف بھی ہیں یا نہیں کیونکہ بیشتر افراد اپنے باپ دادا کو بھلا بیٹھے ہیں، بہرحال یہ مسلم ہے کہ مومن کے چچا غلام حسین خاں سنہ ۱۲۵۸ھ میں حیدرآباد میں تھے اور ان کا خاندان یہیں رہا۔

دادی کی وفات

سنہ ۱۲۳۷ھ میں مومن کی دادی نے انتقال کیا ہے، جس کی تاریخ انہوں نے کہی ہے [۱]

جبکہ اس غم سرا سے رحلت کی | جدہ مومن پریشاں نے
سال تاریخ حسب حال کہا | دخلت بانعیم رضواں نے

اس حادثے کی اطلاع مومن نے اپنے چچا حکیم غلام حسین خاں کو ایک عرصے کے بعد اسطرح دی ہے

" شانزدہ ماہ است کہ جدہ امجدہ براتہ مضجعہا وداع جہان آباد فانی کردند و داغ حسرت دافسوس بسینۂ واماندگان سپردند [۱]

والد کی وفات

سنہ ۱۲۴۱ھ میں مومن کے والد حکیم غلام نبی خاں نے انتقال کیا ہے جسکی تاریخ مومن نے کہی ہے [۱]

پدرم شد اسیر دام اجل | روحش از بند آشیاں رست
طائرے بود آسماں پرواز | رفت بر شاخسار قرب نشست
بمن الہام گشت سال وفات | کہ غلام نبی بحق پیوست
 | ۱۲۴۱

---

[۱] انشائے مومن صفحہ ۱۲۵

(غلام نبی میں حق کا تخلص ہے)

جہان نکوئی نکوے جہاں | وحید زماں والا جوہر یاں
یہاں تک انھیں شوق خلد بریں | کہ ہر دم کو گنتے دم واپسیں
نہ دل میں نہ ان کی زبان پر کبھو | رضائے الہی سوا آرزو
غرض آگیا وقت موعود جب | گئی تن سے وہ جانِ عشرت طلب
تاسف نے کیا کیا ستایا مجھے | قلق نے زمیں پر لٹایا مجھے
غضب جان کو بیقراری ہوی | بری ایسی حالت ہماری ہوئی
کہ دکھا دل عشرت آلود مرگ | ہوی زندگی اپنی محسود مرگ
جہاں سے جب ایسا شفیق اٹھ گیا | تو جینے کا سچ ہے مزا کیا رہا
کہوں کیا کسی سے کہ کیا غم ہوا | سزاوار اشفاق ماتم زدا
دے شعر کی جو ہوس ہے کمال | اسی غم میں تاریخ کا تھا خیال
جنازہ اٹھایا فرشتوں نے آہ | تو قدسی نے زموز اعظما کہا

۱۲ ھ ۴۱

لڑکے کی ولادت

۱۲۵۸ھ میں مومن کے گھر ایک لڑکا تولد ہوا جس کی خوشی مومن کو بے انتہا ہوئی چنانچہ تاریخیں لکھی ہیں ؎

خلفے دادہ اند مومن را | کہ سزاوار دولت و رشد است
گر تو سال ولادتش پرسی | گل گلزار دولت و رشد است

۱۲۵۸ھ

تا گل آمد د شاخ امیدم | روز نوروز آخر سال است
دے برائے من است فرمد دیں | عہد جوش بہار آمال است
از بہ سپہرم رسیدہ جہانے | کہ بہ یمن قدم عدو مال است

برپیشِ دولتے ہمی آید — دل گواہ نکوئی فال است
بلبلِ باغبانِ عالم را — نغمہ سنجِ سپاسِ افغال است
بارور گشتہ نخلہائے مراد — لذت از پختگی فزوں بال است
پسرم دادہ اند وسالِ وجود — نوگلِ باغِ جاہ و اقبال است

۱۲ ۵۸

اس لڑکے کا نام احمد نصیر رکھا گیا اور چونکہ اس کی کم سنی ہی میں مومن کا انتقال ہوگیا تھا اسلئے ننہال ہی میں تعلیم و تربیت ہوئی۔ احمد نصیر نے دو لڑکے اور دو لڑکیاں یادگار چھوڑیں، ۱۔ محمد نصیر ۲۔ عبدالوہاب ۳۔ عزیزہ بیگم ۴۔ عائشہ بیگم، محمد نصیر مدتوں گوالیار میں رہے اور غالباً وہیں انتقال ہوا، عبدالوہاب نے ایک فرزند محمد صدیق چھوڑ کر انتقال کیا۔

عزیزہ بیگم کی شادی حاجی علی خاں تاجر دہلی و مکہ معظمہ کے پوتے عبدالرحمٰن سے ہوئی تھی جن سے دو لڑکے چار لڑکیاں ہوئیں،

لڑکوں کے نام: ۱۔ عبدالمنان، ۲۔ خلیل الرحمٰن ہیں جو لاولد فوت ہوئے،

۱۔ نصیرا بیگم، ۲۔ حمیدہ بیگم، ۳۔ امینہ بیگم، ۴۔ حبیبہ بیگم، صاحبِ اولاد ہیں،

عائشہ بیگم کی شادی عبدالوہاب بھوپالی سے ہوئی جن سے ایک لڑکی زینب بیگم ہوئی جو صاحبِ اولاد ہوئی، (تفصیل کے لئے دیکھو شجرہ)

لڑکی کی ولادت

سنہ ۱۲۵۹ھ میں مومن کو ایک لڑکی محمدی بیگم پیدا ہوئی جس کی تاریخ انہوں نے کہی ہے ؎

دخترِ روشن رواں ہوئی پیدا — کیا ہی چمکا ہے اخترِ مومن
نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے — کہی تاریخ دخترِ مومن

۵۹ ر ۱۲

(دخترِ مومن سے فال کا تخرجہ ہے)

ان صاحبزادی کی تعلیم و تربیت بھی ننہال میں ہوئی اور غازی پور زمنیہ میں عبدالغنی وکیل سیتاپور سے بیاہی گئیں ان سے دو لڑکے ۱۔ ناصر حبیب، ۲۔ عبدالحئی ہوئے، محمدی بیگم نے ۱۲۸۶ھ

میں انتقال کیا خود عبدالغنی نے تاریخ لکھی ہے ؎

اے غنی مصرع تاریخ سر قبر نویس　　　بسوئے ملک عدم ہمنفس دہم رفت

عبدالحئی نے لاولد انتقال کیا، ناصر حبیب سے سید خواجہ ناصر وزیر سجادہ درگاہ خواجہ میر درد کی صاحبزادی بیاہی گئیں، جن سے دو لڑکیاں ۱۔ منو بیگم، ۲۔ لیق سلطان ہوئیں، جو لکھنؤ میں بیاہی گئیں، منو بیگم لاولد فوت ہوئیں، لیق بیگم سے دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہوئیں، ایک لڑکی دہلی میں حضرت محبوب الٰہی کے خادموں میں سے کسی سے بیاہی گئی اور دوسری سیتاپور میں، مومن کا شجرہ خاندان مجھے مرزا فرحت اللہ بیگ سے ملا اور دوسرا شجرہ سید خواجہ ناصر وزیر اور سید خواجہ ناصر جلیل سے ملا ان تینوں شجروں میں مکمل ترین شجرہ خواجہ ناصر وزیر کا دیا ہوا تھا جس میں آخر تک کے اندراج تھے مگر یہ شجرہ بھی مجھے آج سے بیس برس پہلے ملا تھا اس کے بعد ناصر وزیر اللہ کو پیارے ہو گئے، ناصر جلیل حیدرآباد ہی میں ہیں مگر وہ خاندان سے بالکل کورے ہو گئے ہیں انہیں حالات کا علم ہی نہیں، انہی تینوں شجروں کو پیش نظر رکھ کر میں نے یہ شجرہ مرتب کیا ہے جو اس کتاب میں شریک ہے، بعد کے معلومات افسوس ہے کہ فراہم نہ ہو سکے کیونکہ باوجود کوشش کے مومن کے خاندان کے باقیات صالحات نے جواب ہی نہیں دیا۔

چچی کی وفات

سنہ ۱۲۶۰ھ میں مومن کی چچی حکیم غلام حیدر خاں کی بیوی نے انتقال کیا ہے کیونکہ مومن کے دو ہی چچا تھے ایک غلام حیدر خاں اور دوسرے غلام حسین خاں چونکہ غلام حسین خاں حیدرآباد میں تھے اور ان کے متعلقین بھی انہیں کے ساتھ تھے اس لئے مومن خاں ان سے بہت دور ہو گئے ہیں میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ یہ چچی حکیم غلام حیدر خاں ہی کی بیوی ہوں گی ان کی تاریخ بھی مومن نے لکھی ہے ؎

عمر مومن جو باکردار نیک　　　زین جہاں شد سوئے جناب النعیم
سال تاریخ وفاتش خواستم　　　ہاتفے گفت لہا اجر عظیم

سنہ ۱۲۶۳ھ میں اپنی مخدومہ فرزند نے انتقال کیا ہے جن کی تاریخ مومن نے لکھی ہے ؎

عمزادہ جوان من افسوس در گذشت — نادیدہ ہیچ راحت ایں جہاں ہمائے
ہنری رسد بہ جنت دشوری نقد بہ عرش — اینست گر گریستن من نہ ہائے ہائے
تاکے بر آید اشک نہ چشم و فغاں نہ لب — اے مرگ از نکبتگہ وا ے جان آزتن برائے
نیکو سرشت بود نمو زیست نیک مرد — مومن اگر توانی ازیں نیکیہ سرائے
با ایں چنیں تعب نتواں گفت نکتہ سنج — با ایں چنیں الم نتواں شد سخن سرائے
الا چو ما بلند مقامے کہ شاعری — صدرہ بآستانہ او گشتہ جبہہ سائے
یا یافتم سال بجنب رسید نشس — ادیافتہ مراد خود از رحمت خدائے

۱۲ ۶۳

بیٹے کی وفات

۱۲۶۳ھ میں مومن کے ایک لڑکے نے انتقال کیا۔ قطعہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ دو سال پہلے اس کی ولادت ہوئی تھی مگر کوئی تاریخ ولادت دیوان میں نہیں ہے۔ صرف انتقال کی دو تاریخیں ہیں اور انتقال سے پہلے ایک رباعی بھی بڑی ہی دردانگیز لکھی ہے ؎

اے مہر سپہر نہادہ در جان پدر — الطاف رسولت زپید افزوں تر
فرزندم را شفاعتا کن کہ بہ حشر — کافی ست مرا شفاعت پیغمبر

جگر گوشۂ ما بہ کنج لحد — اماں از جہاں پر آفات یافت
دو سال اندر آغوشش مام و پدر — ستم دیدہ یا اس مکافات یافت
چہ ماتم کہ پیر خرد سال گفت — زہیہات ہیہات بافت

۱۲ ۶۳

دیگر

بخت بدبیں کہ تنم تن پسرم — کرد چوں گنج جا در بر خاک
گر از بہر سال مردن او — کلک مومن نوشت برد خاک
خاک بہ فرق زدولت و دنیا — من نشاندم خزانہ بر سر خاک

۱۲۶۳ھ = ۶۰۰ + ۶۶۳

بیٹی کی وفات

۱۲۶۵ھ میں مومن کی ایک لڑکی فاطمہ سلطان نے انتقال کیا ہے جس کی تاریخ وفات بڑی درد انگیز کہی ہے ؎

رفت لخت جگرم زیر زمیں	چرخ برخاک نشاندم امروز
در غم فاطمہ سلطاں بیگم	صبتِ فاطمہ خواندم امروز [1]
تا بجانش نہ رواں شد دی شب	جاں بتاریخ فشاندم امروز

۵۴ + ۱۲۱۱ = ۱۲۶۵ھ

اس لڑکی کی تاریخ وفات ہی ملتی ہے تاریخ ولادت دیوان میں نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو کہی نہیں گئی یا شریک دیوان نہ ہو سکی' وہ تاریخ جو تال کٹنے کے ساتھ کہی گئی ہے محمدی بیگم کی ولادت کی تھی ان کی نہ تھی'

بہن کی وفات

مومن کی ایک بہن تھیں جن کا نام جنیا بیگم تھا یہ دلی میں بیاہی گئی تھیں انھیں ایک لڑکی زیب النساء بیگم اور دو لڑکے لیسین بیگ اور محمد بیگ تھے' زیب النساء بیگم کی شادی مومن نے میر حسین تسکین سے کر دی تھی جن کے بطن سے عبدالرحمن آہی تھے جنھیں مومن نے پرورش کی تھی اور اپنا بیٹا بنا لیا تھا' افسوس ہے کہ زیب النساء بیگم لیسین بیگ اور محمد بیگ تینوں لاولد فوت ہوئے۔

مومن کو جنیا بیگم سے بڑی محبت تھی' انشائے مومن میں ایک رقعہ بھی ان کے نام ہے جو مومن نے کسی سفر سے لکھا ہے اس میں بھی ان کی علالت ہی کا ذکر ہے معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ بہت لمبی بیماری کھینچتی رہی ہیں ؎

اے خواہر عزیز چہ دیدی کہ محو شد	مہر کساں تو ز دل مہر پرورت
طفلی بیادت آمدہ رفتی بخواب ناز	اندر کنار رخالہ و آغوش مادرت

---

[1] صبتِ فاطمہ ہے :- صبت علی مصائب لو انہا صبت علی الایام صرن لیالیا

دیگر بیا و یک نگہ التفات بمن　　نالیدن و طپیدن اطفال و دخترت

آخر تو ہم زآفت مرحومہ یک کسی　　نما تمے کہ تو کردہ داد رست

یک عمر من بجائے پدر بودہ ام ترا　　یک لمحظہ دخترانہ نہ در بزم سرت

تاریخ مردن کو کہ گوید بخود نسیم　　ہو شتم روانہ سوے عدم شد برابرت

گرازدرون نالۂ موزوں بر آمدہ　　بہر حساب نامرزشتم بشوہرت

داغ جگر گراز بہ نہادہ خیال تو　　بر فرق دختر و پسران و برادرت

انشاے مومن میں رقعہ ۴۳ اپنی بہن[28] کے نام ہے جس میں ان کی سخت بدحالی[12] ہے اور خدا سے امید کی ہے کہ شفا دیگا،[1] رقعہ ۴۴ میں انھیں یہ دو رباعیاں لکھی ہیں ؎

گویند ترا ارشد تن اطہر تو　　تپ گشت حرارت نشاط آور تو

از گردش آسماں سرت می گردد　　اے خواہر مادرت بگردِ سرِ تو

اے راحت جان من سلامت باشی　　باعافیت و طرب بکامت باشی

از بستر ضعف و ناتوانی برخیز　　با شور خرام تا قیامت باشی[2]

کوٹھے سے گرنا

مومن کے دادا نے چیلوں کے کوچے میں ایک مکان خریدا تھا جو مومن کے والد کے حصے میں آیا اور اسی میں مومن رہتے تھے،[3] مرزا فرحت اللہ بیگ نے اس مکان کو دیکھا ہے ان کا بیان ہے کہ "حکیم آغا جان کے چھتے کے سامنے خاں صاحب کا مکان تھا بڑا دروازہ اندر بہت ہی وسیع صحن اور اس کے اوپر کمرہ سامنے کے دالان کی چھت کو کمرے کا صحن کر دیا تھا لیکن منڈیر بہت چھوٹی تھی میں نے خود یہ مکان ۲۰-۲۲

---

[1] انشاے مومن صہ ۱۶۴/۱۶۶　[2] انشاء مومن صہ ۱۶۸/۱۷۰　[3] آب حیات صہ ۴۳۵

سال ہوئے دیکھا تھا' ٹوٹ کر کھنڈر ہو گیا تھا' تین طرف کی عمارت ڈہے گئی تھی' سامنے کا حصہ قائم تھا معلوم نہیں اوپر کی منڈیر کیوں اتنی نیچی رکھی گئی تھی اس منڈیر سے ٹھوکر کھا کر حکیم مومن خاں گرے تھے"

اس مکان کے علاوہ مومن کو جہیز میں بھی ایک مکان ملا تھا مگر شادی کے کچھ عرصے کے بعد مومن نے اس مکان کو اس لئے بیچ ڈالا کہ انھیں اس کی ضرورت نہ تھی'

اپنے موروثی مکان ہی کی چھت پر سے اتفاقاً مومن گرے اور ایسے بے طور گرے کہ ہاتھ اور مونڈھا غالباً ٹوٹ گیا چنانچہ خود انھوں نے "دست و بازو شکست" تاریخ کہی'

دنیائے اردو کے لئے بڑی تکلیف دہ بات ہے کہ مومن کی پیدائش کی تاریخ معلوم ہوئی نہ مہینہ' سنہ البتہ مل جاتا ہے اس طرح ان کے کوٹھے سے گرنے کی بھی تاریخ ملتی ہے نہ مہینہ صرف سنہ ملتا ہے اور وفات کی بھی یہی تاریخ ہے جو کوٹھے سے گرنے کی ہے تاریخ اور مہینے کا یہاں بھی پتہ نہیں' مومن نے دست و بازو ٹوٹنے کے بعد پیشین گوئی کی تھی کہ پانچ مہینے یا پانچ سال تک اور جیوں گا چنانچہ کوٹھے سے گرنے کے پانچ مہینے کے بعد ہی انھوں نے انتقال کیا اور انتقال سنہ ۱۲۶۸ء ہی میں ہوا۔

مرزا قربان علی سالک نے عارف و تسکین و مومن کی وفات کی تاریخ ایک ساتھ کہی ہے عارف کی تاریخ وفات جمادی الثانی سنہ ۱۲۶۸ھ مارچ سنہ ۱۸۵۲ء ہے تسکین کی تاریخ وفات ۱۷؍ شوال سنہ ۱۲۶۸ء ہے معلوم ہوتا ہے کہ تسکین نے مومن سے پہلے انتقال کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۷؍ شوال سے پہلے مومن دست بازو کے ٹوٹنے سے صاحب فراش تھے اور ۱۷؍ شوال کے بعد سے سلخ ذی حجہ تک کسی تاریخ میں انھوں نے انتقال کیا ہے ممکن ہے کہ ذی قعدہ ہی میں انتقال کیا ہو یا ذی حجہ میں بہر حال مومن کا انتقال ۱۷؍ شوال سنہ ۱۲۶۸ھ کے بعد ہونا ثابت ہوتا ہے'

(کلب علی خاں کا مضمون[1])

---

[1] مجلہ اورنگ آباد اکتوبر سنہ ۱۹۲۷ء

مومن کی وفات

دہلی میں بڑے بڑے باکمال جراح تھے، مومن خود حکیم تھے اُن کا پورا خاندان حکیم تھا اُن کے چھیرے بھائی حکیم احسن اللہ خاں خود بڑے حاذق حکیم تھے مگر بدنصیبی سے مومن کا علاج نہ ہو سکا اور پانچ مہینے تک زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہنا پڑا، مگر اس کشمکش کو بھی مومن نے بڑی ہمت اور بہادری سے برداشت کیا، عبدالرحمٰن آہی نے اردو فارسی کلام انھیں سنا کر نظر ثانی کرانی شروع کی اور انہوں نے سارا کلام سن کر جہاں جہاں تغیر و تبدل کرنا چاہا کیا اس طرح مومن نے پورے اردو فارسی کلام کی نظر ثانی کرنے کے بعد سفر آخرت کیا۔

مومن جس علمی ادارے اور ادبی مجلس کے رکن رکین تھے وہ گلدستہ تر و تازہ تھا مومن اس کے پہلے پھول تھے جو مرجھا گئے ظاہر ہے کہ مفتی صدر الدین خاں سے کر صہبائی ممنون اور شیفتہ سے لے کر غالب تک سبھی جنازے میں شریک ہوئے ہوں گے مگر دہلی کے شرفا اور عوام بھی کثیر تعداد میں شریک جنازہ تھے چنانچہ مجدد السنہ مشرقیہ سید احمد حسین شوکت میرٹھی نے لکھا ہے کہ

"مومن کے جنازے کے ساتھ ایک جم غفیر تھا اور آپ کا یہ شعر لوگوں کے زبان زد تھا"[1]

گر پائے نازنین تو رنجد میا میا ۔۔۔ از دور بر جنازہ مومن نماز کن

والد ماجد فرماتے تھے کہ ظہیر دہلوی ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ مومن کے جنازے کے ساتھ دلی کے امراء شرفاء علماء و شعراء اس کثرت سے شریک تھے کہ ایسا مجمع اہل علم و شرفاء کا پھر کسی جنازے میں میری نظر سے نہیں گذرا ہر شخص کی زبان پر مومن کے دو شعر تھے ؎

ز تاب رشک ملائک بہ دوزخ اندازند ۔۔۔ تو بر جنازہ مومن اگر نماز کنی

اس سے مومن کی ہر دل عزیزی اور مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔

مومن کا مدفن

آزاد نے لکھا ہے "دلی دروازے کے باہر میدیہنیوں کے جانب غرب زیر دیوار احاطہ

---

[1] ماہنامہ مخزن لاہور نومبر ۱۹۱۴ء صہ ۴۳

مدفون ہوئے شاہ عبدالعزیز صاحب کا خاندان بھی یہیں مدفون ہے [۱]

چونکہ مزار پر کوئی کتبہ نہ تھا اور مومن کے خاندان والے مزار پر آتے جاتے نہ تھے اس لئے عرصے تک مزار کا علم ہی نہ ہو سکا بعد مرزا فرحت اللہ بیگ نے بڑی مشکل سے پتہ چلا کر بیشتر لوگوں کو بتا دیا تھا جسے درست کرکے لوح مزار پر کتبہ بھی لگا دیا گیا ہے جس کی تصویر حاصل کی گئی ہے اس تصویر کے لئے عزیزم ظہیر احمد صاحب' ایم' اے (دہلی کالج) اور عزیزم نثار احمد فاروقی (دہلی یونیورسٹی لائبریری) کا ممنون ہوں کہ دونوں نے بیک وقت عنایت کی۔

مومن کی وفات کی تاریخیں

مومن نے کوٹھے سے گرنے کے بعد "دست و بازو شکست" جو تاریخ کہی تھی وہی تاریخ وفات بھی بن گئی کیونکہ اسی سال حادثہ کے پانچ مہینے کے بعد مومن کا انتقال ہوا ہے'

مومن کے شاگرد حکیم غلام مولا قلق نے تاریخ کہی ہے ؎

چوں عقل بود دل زخود گم — از صدمہ جاں گزائے مومن
نو چرخ دوند بیخود اند — نہ بار صدائے ہائے مومن
(۶۸ ۲ ۱۴)

مرزا صابر نے تاریخ کہی ہے ؎

بر لب کوثر و تسنیم بر فت — تشنۂ جام محبت مومن
گفت تاریخ وفاتش ہاتف — یافت مقبولی جنت مومن
(۶۸ ۱۲)

چونکہ زین العابدین خاں عارف' میر حسین تسکین اور مومن نے ایک ہی سال میں چند مہینوں کے فاصلے سے انتقال کیا تھا اس لئے قربان علی سالک نے تینوں کی ایک ہی تاریخ کہی ہے ؎

برس دن میں موئے یہ تین شاعر — کہ جو تھے حضرت دہلی کے ساکن

---

[۱] آب حیات صفحہ ۴۳۲' [۲] آب حیات صفحہ ۴۴۳

نہ ہاتھ آئی کوئی تاریخ رحلت رہی فکر اسکی سالک کو بہت دن

کہا دل نے کہ داخل ہو گئے سب ارم میں عارف و شکیبؔ و مومنؔ[1]

اجودھیا پرشاد صبر نے "ماتم مومن خان" اور محمد بشارت علی صدق نے "مومن آباد کرد خلد برین"

سے تاریخ نکالی ہے[2]

"ماتم مومن خاں" چونکہ مستقل مادۂ تاریخ ہے اس لئے بہت سے شعراء نے یہی تاریخ پائی ہے

چنانچہ آہی (عبدالرحمٰن) نے بھی یہی مادہ نکالا ہے اور بعض دوسرے شعراء نے بھی۔

مومن جنتی

محمد حسین آزاد نے لکھا ہے "مرنے کے بعد لوگوں نے عجیب عجیب طرح سے خواب میں دیکھا ایک خواب نہایت سچا اور حیرت انگیز ہے نواب مصطفیٰ خاں نے دو برس بعد خواب دیکھا کہ ایک قاصد نے آکر خط دیا کہ مومن کا خط ہے انہوں نے لفافہ کھولا تو اس کے خاتمہ پر ایک مہر ثبت تھی جس میں مومن جنتی لکھا تھا اور خط کا مضمون یہ تھا کہ آج کل میرے عیال پر مکان کی طرف سے بہت تکلیف ہے تم ان کی خبر لو صبح کو نواب صاحب نے دو سو روپے ان کے گھر بھیجے اور خواب کا مضمون بھی کہلا بھیجا۔ ان کے صاحبزادے احمد نصیر خاں سلمہ کا بیان ہے کہ فی الواقع ان دنوں ہم پر مکان کی نہایت تکلیف تھی برسات کا موسم اور سارا مکان ٹپکتا تھا"[3]

مومن خاں نے جو کچھ کیا کیا آخر میں تو انہوں نے توبہ کر لی اور بڑے اچھے اوقات ہو گئے تھے انکا بخشا جانا کوئی بات نہیں مگر حیرت ہوتی ہے اللہ میاں کی اس بندہ نوازی پر کہ ابو نواس جیسا آلودہ بخش دیا گیا۔ ابوالبرکات عبدالرحمٰن بن محمد انباری (متوفی ۵۷۷ھ) نے "نزہۃ الالباء فی طبقات الادباء" میں لکھا ہے:

احمد بن یحییٰ محمد بن رافع سے روایت کرتے ہیں کہ ابو نواس سے میری دوستی تھی مگر ان کے انتقال

---

[1] بہار سالک صفحہ ۱۱۳، ۱۱۴ [2] گلستان صابر صفحہ ۴۳۹ [3] آب حیات صفحہ ۴۴۲

کے وقت میں پاس نہ تھا جب انتقال کی اطلاع ملی تو میں بہت ملول ہوا، اسی رات میں نے نیم بیداری کی حالت میں دیکھا کہ ابو نواس میرے پاس بیٹھا ہے میں نے کہا، ابو نواس! اس نے کہا یہ وقت کُنیت کا نہیں ہے، پھر میں نے کہا حسن بن ہانی! کہا، ہاں، تو میں نے کہا، اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ کیا سلوک کیا؟ کہا اللہ عزوجل نے مجھے بخش دیا ان شعروں کے سبب جو میں نے کہے تھے اور وہ میرے تکیے کے نیچے رکھے ہوئے ہیں پھر میں نے اس کی تصدیق کے لئے اس کے گھر جاکر دریافت کیا تو معلوم ہوا مرنے سے پہلے اس نے دوات وقلم منگوایا تھا مگر کوئی تحریر اس کی نہیں ملی، میں نے اس کا تکیہ الٹ کر دیکھا تو یہ اشعار اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ملے"

یا رب ان عظمت ذنوبی کثرۃ	فلقد علمت بانّ عفوک اعظم
ان کان لا یرجوک الا محسنٌ	فمن یلوذ و یستجیر المجرم
دعوک ربّ کما امرت تضرعاً	فاذا رددت یدی فمن ذا یرحم
مالی الیک وسیلۃٌ الا الرجاء	وجمیل عفوک ثم انی مسلم

جو غفور رحیم ابو نواس جیسے آلودہ کو بخش دیتا ہے وہ مومن کو کیوں نہ بخشے جبکہ وہ واقعی مومن ہو، یہ روایت دلی میں کئی طرح مشہور ہے جس سے اس خواب کے صحیح ہونے کے خیال کی تائید ہوتی ہے بہر حال ان روایتوں سے یہ ضرور ثابت ہے کہ مومن کی بخشایش کا یقین دلی والوں کو تھا اور اب تک ہے۔

مومن کی تصانیف

مومن کا اردو دیوان سب سے پہلے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۷ء میں "دیوان بے نظیر" کے نام سے مرتب کیا تھا۔ جس پر انہوں نے ایک دیباچہ بھی لکھا تھا اس دیوان کو سب سے پہلے ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۶ء میں مولوی کریم الدین مولف طبقات الشعراء نے دہلی سے شائع کیا، بلوم ہارٹ کا بیان ہے کہ مومن کا ایک دیوان میرٹھ میں ۱۸۶۵ء میں طبع ہوا اور ایک کانپور سے بھی شائع ہوا ہے جس کا انتخاب رہتک سے بھی شائع ہوا ہے، اور مومن کا ایک مخطوطہ ۱۵ ذیقعدہ ۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۹ء

کا مکتوبہ جس کا کاتب دولت سنگھ ہے۔ نمبر (U-III-FOLL 203) پر انڈیا آفس میں محفوظ ہے[۱]
مومن کا ایک قلمی دیوان جو ۱۲۶۴ھ کا مکتوبہ ہے جس کے کاتب کا نام فدا حسین ہے، پروفیسر ضیاء بدایونی
کے پاس بھی موجود ہے۔

رضا لائبریری رامپور میں تین اردو مخطوطے ہیں، ایک مخطوطہ جس پر سنہ کتابت ہے اور
نہ کاتب کا نام ہے۔ مجبی عرشی کے خیال میں مومن کے اپنے قلم کا لکھا ہے جس کے صفحات ۱۴۷ ہیں اور
ایک نسخہ بھی بے تاریخ اور بے کاتب ہے جس کے اوراق ۲۳۲ ہیں ایک اور اردو مخطوطہ بھی ۱۱۲ اوراق کا
ہے، جس کا کاغذ اور سائز مومن کے ایک فارسی مخطوطے سے ملتا جلتا ہے جو ۱۲۸۹ھ کا مکتوبہ ہے، یہ
فارسی مخطوطہ بھی رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔

مومن کے کوٹھے سے گر کر صاحب فراش ہونے کے بعد حکیم احسن اللہ خاں اور عبدالرحمٰن آہی نے
مومن کا اردو فارسی کلام انھیں سنا کر نظر ثانی کرا لیا تھا چنانچہ اس اردو دیوان کو مصطفیٰ خاں شیفتہ
کے پرانے دیباچے کے ساتھ ایک نیا خاتمہ لگا کر عبدالرحمٰن آہی نے محفوظ کر دیا، جو بعد کو طبع ہوا اور
اب تک وہی کلیات طبع ہوتا جا رہا ہے۔

۱۲۸۲ھ میں حکیم غلام مولا قلق نے ایک دیوان مومن شایع کیا تھا جو اب بالکل نایاب ہے
اس کا ایک نسخہ میرے پاس موجود ہے[۲] لکھنؤ، کانپور وغیرہ سے اب تک بے شمار مومن کے دیوان اور
کلیات شایع ہوئے ہیں اور ہر بعد کے نسخے میں پہلے سے کچھ زیادہ غلطیاں ہوتی گئی ہیں اس طرح
دیوان خاصا غلط سلط ہو گیا ہے،
ان طباعتی غلطیوں کو محسوس کر کے پروفیسر بدایونی نے بعض قلمی نسخوں سے مقابلہ کر کے ایک صحیح

---

[۱] فہرست مخطوطات انڈیا آفس لائبریری مرتبہ بلوم ہارٹ ص ۱۱۵، ۱۱۶ [۲] اس
دیوان کو محمد ہاشم چھاپہ خانہ ہاشمی نے ۲۵ رجب ۱۲۸۲ھ کو مطبع ہاشمی میرٹھ میں ۳۸۶ صفحات ڈبل
سائز پر چھپوایا ہے ~ قلق از روے حکمت گفت سالش کلام مومن است آیات قدسی
۸۲ ۱۲

نسخہ مرتب کر کے ۱۹۳۳ء میں شانتی پریس الہ آباد سے بعض اشعار کی شرح کے ساتھ شایع کر دیا تھا جو بہت پسند کیا گیا۔

جب میں نے مومن پر کام شروع کیا تو مومن کے متداول دیوان کے غزلوں کی ایک فہرست بنا کر محبی عرشی کے پاس بھجوا دی تھی کہ رضا لائبریری کے مخطوطوں سے مقابلہ کر لیں جب انہوں نے اس فہرست کا مقابلہ کیا تو چند غزلیں ایک دیوان میں ایسی ملیں جو متداول نسخوں میں نہیں ہیں' ان غزلوں کو عرشی صاحب نے مجلہ نگار لکھنؤ میں چھپوا دیا ہے اور یہ دیگر ضیاء بدایونی نے شانتی پریس والے نسخے کے دوسرے اڈیشن میں بھی شایع کر دیا ہے۔

مومن کے انتخابات بھی ہندستان اور پاکستان سے شایع ہوئے ہیں چنانچہ حال ہی میں ایک شرح انتخاب انجمن ترقی اردو دہلی نے بھی شایع کیا ہے۔

اب مومن کا اردو دیوان حضرت عرشی ایڈٹ کرنے کی فکر میں ہیں اگر موصوف اسے ایڈٹ کر دیا تو بڑا کام ہوگا اور غالب کے دیوان (عرشی اڈیشن) کی طرح مومن کا (عرشی اڈیشن) بھی بے نظیر ہوگا۔

انشائے مومن

مومن کے متفرق رقعات اور نثر کے نمونے ان کی زندگی ہی میں حکیم احسن اللہ خاں نے جمع کرنے شروع کر دیئے تھے جنھیں مومن کے انتقال کے بعد رمضان ۱۲۷۱ھ میں مطبع سلطانی واقع اردو دہلی میں ۸/۱ کی سائز کے (۲۵۶) صفحات (۱۴ سطری مسطر) پر شایع کیا ہے حکیم احسن اللہ خاں نے انشائے مومن پر دیباچہ لکھا ہے جس میں مومن کو "خال زادہ خود" لکھا ہے' ان رقعات کو تین ابواب پر تقسیم کرنے کے بعد لکھا ہے کہ "دریں دیباچہ خلاف رسم مستمرہ در مدح مداد صاف و توصیف حزن و علومش غلو نکردہ ام و فضائل و کمالاتش یکیک نشمردہ از انست کہ صیت ہنر ہایش اطراف گیتی را فرا گرفتہ و شہرت دانش و خردہا بسوے عالم رفتہ کدام کافر کیش است کہ از حال محمود خاں گرامی برادرم آگاہ نیست وکدام بد اندیش است کہ سر بہ نہادۂ آں درگاہ بہشت بر گرامی دائم از من نکو تر می داند وہر کرا ہمیں از من فزوں تر می شناسد از خامہ فرسائی بے صرفہ چہ حاصل وازہرزہ درائی بیہودہ چہ فائدہ۔۔۔۔۔۔

تا زبان ان ن نطق آشناست ایں نثر دل پسند ورد زبان نکتہ سنجاں باد"

اس مجموعے کو تین ابواب پر تقسیم کیا ہے

باب اول' نامہ ہائے کہ شعر بطرز تحریر آں منشی بے نظیر است

باب دوم' رطب و یابسے کہ بہ نظر نا فہمی مخاطب نگاشتہ

باب سوم' نقارِیظ و خطبہ و بعد ازیں ہر چہ بدستم می افتد ہمدریں سفینہ دصل شنت نمائیم'

انشائے مومن میں (۱۳۰) رقعات ہیں جن میں آخری رقعہ منظوم ہے جس میں (۵۳) شعر ہیں

یہ حکیم احسن اللہ خاں کے نام ہے ۔

اے باد صبا چہ ہرزہ تازی برجلوۂ بوستاں چہ نازی

ایک تقریظ کتاب سخن زبان امیری پر اور ایک تقریظ تذکرہ گلشن بے خار پر اور تین چار دیباچے

تقویم کے ہیں'

گلشن بے خار کی تقریظ تو اس تذکرے کے ساتھ طبع ہو کر عام ہو چکی ہے زبان امیری کی تقریظ البتہ دیکھنے میں نہیں آئی' پہلا رقعہ جو چار پانچ صفحات پر محیط ہے شکوہ نارسی احوال پر مشتمل اور فقط لفاظی کا مظہر ہے دوسرا رقعہ جو چھ صفحات تک پہنچتا ہے اسی طرح کا ہے مگر اس میں مومن نے تعلی بھی خوب کی ہے' چند سطریں نقل کی جاتی ہیں'

.... تغافل پژوہا! مہربانی نامہ بتاکید ارسال مسودات مکاتیب تزویید رقم دار سیدہ واز کاکل سلسلہ مویان آشفتہ تر گردانیدہ ہنوز خامہ رام لب جواب نکشودہ بود کہ نامہ دیگر بمضمون شکایت تغافل ورود فرمود' لاجرم خوی پیماں شکن و خاطر عہد گسل از کافر کیشاں مسلمان دشمنی، تعارہ نمودم وزبان نیاز بپاسخ فرمان واجب الاذعان کشودم توفیق عذر بنو شیدن و بدرد دل رسیدی روزی باد پیداست کہ گوہر معانیم ہمہ بے بہاست و درہائے مضامینم از دریا در جنب زر تمام عیار سخنم کوی دست افشار پرویز کم است، و پیش گنجینۂ سینہ ام خزینۂ قارون در کدام شمار یاقوت معانی رنگینم بازار لعل لب رنگین لباں شکستہ واز رشک آب و تاب دُرّ ثمینم خاطر بہ لولوی اشک صافی گہراں شکستہ ابیات

بہ بحر و کان معانی است قدر تم نہ برم	چو غلسان گہر و لعل ہائے ایثاری
منم کہ نیست بجرئم فصاحت سحبان	منم کہ نیست بہ نطقم زبان مختاری
صحیفہ کہ نگارش بہ کلک من باشد	بلوح حفظ نہ کشد از بلند قعد اری
بہ حکم نادرہ سنجی یگانۂ دہر ام	نہ کس بہ نظم عدیلم نہ کس بہ نثاری
ز فخر بندگیم نزد شاعر شروان	یکے ست معنی خاقانی و پرستاری

امالبعد از قدر ناشناسی و سخن نافہمی ایں ہیچکم خریدار نیست و جواہر زواہرم را بہ شہر نگمی نیز روز بازار زانی گرد کساد آں قدر نشستہ کہ طوفان نوح از متاع تختہ بند من تواند برون و زنگار ناروائی آب حال نہ بستہ کہ غبار صرصر عاد آئینہ ام را بجلا خواہد آوردن، یوسفم را بہ کلاوۂ پیر زال نمی خرند و از چاہ کنعانی نسیم قلب ہم برند با انجاز ید بیضا تہی دستم و یا دم عیسوی دار پرست......" (ص ۱۵)

تازہ منتی کہ سپہر کہن دشمن لموہ انیست کہ کف خاکی ورثۂ مادری داشتم بہ ترکتاز بیصرفہ در ربودہ فرد

خاک بر فرق آسمان بلند	سرفرازی چو من بخاک افگند

خوں گرفتہ کہ ہنوز از قتلش فتنہ پابر پاست و روح ناپاکش مانند بی جان ہنگامہ اسواب آرا روزی بیشتر از کشتہ شدن زمین موروثیم کہ نان جوین مرا کفایت کردے بضبط سرکار اندریت در آوردہ خاک مذلت بفرق روزگار خود بیخت و گرد دل آزاری و ستم شعاری بہوائی نفسی چند کہ داشت دامنم شمردہ میگذاشت برانگیخت ہمانا بسزائے ہمیں بیداد خاک برابر گردیدہ و بپاداش ستم باسفل السافلین رسیدہ" (ص ۱۷) .... شہاب الدین نامی کہ بہ تعلیم اولاد غفور خاں انجا واہ کشیدہ است زمانہا بصحبت ایں ہیچدان رسیدہ گاہے زانوی سبق خوانی بہ پیش من تہ میکرد جزوے چند تمہید حکایت بے وفائی و کج ادا ر رقم زدہ بودم بغارت برد کہ از چنگال آں جفا پیشہ صیاد ناقدرداں در ربایہ صید معانی شوخی سرشت بی تردد کمین بدام می آید۔ والسلام" (ص ۲۲)

اپنے ایک شاگرد شیخ غلام ضامن کرم کو ایک رقعہ لکھتے ہوئے اپنی ایک غزل کے سات شعر نقل کئے ہیں جو ان کے دیوان میں موجود نہیں ہے مطلع ہے ؎

اے مرگ ترا جاں شدہ مشتاق ترا شب　　　سوئے تو خود آید تو نہ آئی اگر امشب

اس کے بعد اور ایک رقعہ کرم ہی کے نام ہے جس کے چند سطر نقل کئے جاتے ہیں۔

"...... اگر از حرام توبہ کردہ ام حلال نہ گذاشتہ ام وچوں جہلائے بیکار رنجہا کشیدہ ام وبدیں پیوستن دہاقین بہ اطوار معصیت ہا دیدہ ام، برآں دارم کہ با ہمچو عالی خاندانے فلک شکوہے وصلت نمائم وتماشا طلب بدیدار خوش نسبی زہرہ گوہرے کشایم ورنہ از دوسہ جا پیغام تلخ بر زبان ومژدہ از وصال برخوردن درمیان اگر انصاف باشد ازیں نسبت کہ من دختر ش را بعقد آوردہ ام تا روز حشر فخر ومباہات سخنی بہ زبان بیارد وایں ہرزہ درآی واتراز خانی خود یکبارہ درگزارد مباہات ومباہات کہ بایں علوشان با مشتی خاشاک منشی ساختم وبکمندیں آسمان پایگی بکف فلک پر انجم آمد" (صـ۵۷)

اسی خط میں سعد قلی خاں متوسل بیگم شمرو کے متعلق لکھا ہے کہ "از غلامان خاندان ماست" او رآگے چل کر بیگم شمرو کے متعلق لکھا ہے کہ "ہجو دایں کمترین بی سروایں است" (صـ۵۸)

رقعہ بنام حکیم احسن اللہ خاں کے نام بڑا مزے دار ہے۔

"گرامی برادرم! قرارداد ایں ست کہ چوں مہر جہاں تاب در اسد درآید قرص زری از خزینۂ نواب ثریا جناب تاکیسۂ خاکسار رسد، اکنوں کہ تحویل سرطان است وبجا رسیدنش را دیرے فی بیامری آں آسمان مروت میخواہم کہ پروردہ اش از خزانہ عامرہ تا خزانہ دہلی کہ کم از درجہ خواہد بود قطع راہ کند اگر دستوری بخشند قبض الوصول رقم زدہ آید چہ اگر از حساب پارسیاں شماری بر گیرند تا رسیدن بخوشہ تو اندرسید چشم دارم کہ تخم ریزی التماس بیار دبرو رسد اگرچہ کدورت آگیں شورش پسند کار گذاران زمین شوراست کہ خراب بادہ السلام" (صـ۶۴)

اس مجموعے میں نواب تجمل حسین خاں کے نام کئی خطوط ہیں چنانچہ تجمل حسین خاں اور کرم احمد کی رنجش سے متعلق بھی ایک خط ہے اور خود مومن سے رنج کدورت کے بعد جو خط تجمل حسین خاں نے لکھا ہے اس کا جواب بھی ہے اسی سلسلہ میں ایک رقعہ میں چند شعر بھی لکھے ہیں جن میں سے دو نقل کئے جاتے ہیں ۔

آں کس کہ ہست یارِ من و دوستدارِ من | آں کس کہ خواہمش بدل و خواہمش بجاں
فخرِ جہاں وحیدِ زماں و فریدِ عصر | یکتائے دہر یعنی تجمل حسین خاں

رقعہ ۲۸ سے جو حکیم احسن اللہ خاں کے نام ہے معلوم ہوتا ہے کہ رقعہ ۱۴۲ میں جس رقم کا ذکر ہوا ہے وہ مومن کا سالیانہ ہے جو ہر سال ملا کرتا ہے اس رقعہ میں رقم کی صراحت بھی موجود ہے اور گذشتہ سال کی رقم حاصل کرنے کا ذکر بھی، شاید کوئی اراضی ہوگی جو حکیم احسن اللہ خاں اور مومن میں مشترک ہو جس کا حصہ مومن پاتے ہوں بہر حال تفصیلات اس سے معلوم نہیں ہو سکتیں صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ نو سو اڑتیس روپیہ سالانہ مومن کو ملتا تھا۔

خردمند برادر دانش جوہر سلامت! رسیدن آفرین مہربانی نامہ بہ مضمون بدمعاملگی خزینہ داران خیانت فطرت و اقرار دادن ہشتصد و ہشتاد پول سپید حیرت افزا گشت، سال رفتہ یکصد و بست تمن کہ برائے این جا ہفتصد و شی و ہشت روپیہ بسکۂ کلدار باشد گرفتہ بودیم امسال بکدام جرم عِوض شصت روپیہ تاوان کشید و از انجا کہ مصرع گواہ عاشق صادق در آستین باشد عنایت نامہ پاریہ بلف التماس نامہ از نظر می گذرد اگر ستقامت حال خزانچیاں باعث بدین بودہ باشد نمی تواں بر یزیدنت آخر ہر چہ بر سر شاں رود از دست نواب فلک رکاب جنانست و تجویز امراد بے مصلحتی نیست کہ خواہد پسندید کہ ما بر عکس رضائے ملازمان جناب ممدوح تلافی نقصان شاں کنیم بہمہ حال آنچہ صوابدید خدام باشد براں کار تواں کرد بیت

سپردم بتو مایۂ خویش را | تو دانی حساب کم و بیش را

والسلام (صـ ۱۰۶)

رقعہ ۱۴۲ اپنے چچا حکیم غلام حسین خاں کے نام لکھا ہے، جو اس طرح شروع ہوتا ہے۔

"مومن صداقت کیش عقیدت آئین زمین بوسی درگاہ سپہر اشتباہ خدام کرام عم بزرگوار قدر اقتدار فلک خیام عرش مقام قبلہ و کعبہ نیاز پرستان ارادت دین افاض اللہ علینا رشدہ وہدایتہ! (صـ ۱۲۴)

"...... پیشتر ازیں در التماس نامۂ کہ بنام والدم کلک صداقت نگار ریختہ است بہ تہنیت حج واجب بزمین پاک حرمین شریفین کہ نصیب ہر مومن باد اشعاری رفتہ بنا بریں نیاز مند مخلص نیز بعرض حال سعادت اندوز جاوید نگشتم، ایں زماں کہ ہم از سید محمد زکی وہم از دیگر کساں ہنوز توقف ملتزماں رکاب فیض انتساب در حیدر آباد گوش خورد و یقین دانستم کہ آقائی قدر داں جدائی آں مجمع علوم و فضائل گوارا ندارد...... شانزدہ ماہ است کہ جدہ امجد بروا اللہ مضجعہا وداع جہاں آباد فانی کردند و داغ حسرت و افسوس بسینۂ واماندگان سپردند.........

چندیست کہ آشنا زادہ ام لالہ سیام لعل در رسالہ نواب مشیر الملک بسفارت میگذراند غالباً از ملازمت والا و حضرت اعلیٰ بہرہ یاب باشد بنا علیہ خامہ گستاخ نیاز شوخی تحریر عادش می کند و چشم آں دارم کہ بہر کارے کہ دارد بہر چہ التجا آرد حاجت روای و لطف زمانی بکار در آید" (ص ۱۲۵)

دریں دیار خراب کہ بدست کفرو جاہل بیقدر افتادہ قدر شریف و نجیب حکم کیمیا گرفت و دولت و اقبال ترجمۂ عنقا شد لاجرم سفر لکھنو صوابدید خاطر است اگر در انجا از رشتۂ مطلب گرہ کشود نیکو تر ورنہ عزم آں دیار ہم بدل می خلد کہ بسیار کس قدر دانی راجہ چندو لال بہادر نسبت بارباب کمال و شعراء الموده اند و ایں ہیچ مداں را بوے ازیں گلزار بدماغ اندیشہ رسیدہ باجملہ اگر خواستہ ـــ تعالیٰ است بدولت قدمبوس سرمایہ اندوز می شوم" (ص ۱۲۶)

رقعہ ۲ میں کسی کو لکھا ہے انھیں درد گردہ کی تکلیف ہے، اس کے علاوہ کسی خط میں اپنی کسی علالت یا بیماری کی تفصیل نہیں ہے، فرمان امیری کی تقریظ بھی گلشن بے خار کی تقریظ ہی کی طرح نفاظی اور لفظی صورت گری کا گورکھ دھندا ہے اسی طرح سالانہ تقویموں کے دیباچے بھی ہیں مگر یہ دیباچے ان تقاریظ سے زیادہ سہل زبان میں ہیں مگر ان میں نہ تو سالانہ نجوم کی پیشن گوئیاں ہیں اور نہ اثرات سیارگان وغیرہ کی تفصیل ہے۔

اس کتاب کی طباعت کے بعد چونکہ غدر ہوا اور پوری کتابیں جو حکیم احسن اللہ خاں کے

گھر پر تھیں جلادی گئیں اس لئے دیوان اور انشاء دونوں نایاب ہو گئے ہیں ایک ایک جلد لٹن لائبریری علیگڈھ اور لکھنؤ کے کسی صاحب کے پاس رہ گئی ہے مجھی نیاز فتحپوری مدیر نگار نے لکھنؤ والا نسخہ مجھے بھجوایا تھا جس سے یہ اقتباس میں نے لیا ہے۔

دیوان فارسی

مومن کا فارسی دیوان بھی انشائے مومن کی طرح حکیم احسن اللہ خاں نے مطبع سلطانی ارک دہلی میں ۱۰ ذیقعدہ ۱۲۷۱ھ کو چھپوایا ہے جو رائل سائز کے (۹۰) صفحات پر طبع ہوا ہے جس کا مسطر (۱۵) سطری ہے، یہ بھی نایاب ہو گیا ہے۔ اس کی نقل لٹن لائبریری علیگڈھ سے مجھی پروفیسر ضیاء بدایونی نے مجھے کرادی ہے جو میرے پیش نظر ہے۔

مفروضہ تصانیف

عرش گیاوی ایک بڑے مخلص بزرگ تھے جنہیں مومن سے بڑی محبت اور عقیدت تھی انہوں نے ۱۳۴۵ھ میں ایک مختصر سی کتاب حیات مومن نام سے لکھی ہے پونیا سائز کے (۴۴) صفحات پر مومن کی زندگی ان کا کلام وغیرہ پیش کیا ہے چونکہ عرش مرحوم پرانی وضع کے بھولے بھالے بزرگ تھے اس لئے جس نے جو کچھ کہا انہوں نے لکھ لیا اسی طرح مومن کی حسب ذیل تصانیف بھی انہوں نے اپنی کتاب میں لکھ دی ہیں۔

۱۔ جان عوض، ۲۔ شرح سدیدی ونفیسی، ۳۔ رسالہ درخواص پان، مگر حقیقت یہ ہے کہ۔ ۱۔ کلیات اردو، ۲۔ دیوان فارسی، ۳۔ انشائے مومن کے علاوہ کوئی کتاب مومن کی نہیں ملتی قصائد مومن کو علیحدہ کتابی صورت میں پروفیسر ضیاء بدایونی نے چھپوادیا ہے اور اب پھر انہی قصائد کو حضرت ضیاء کے فرزند ارجمند ظہیر احمد سلمہ بھی چھپوا رہے ہیں میں نے مومن کی مثنویاں مرتب کرلی ہیں اگر موقع ملے تو انشاء اللہ طبع کرادوں گا ورنہ کلیات میں تو یہ موجود ہی ہیں اور کلیات عام طور پر دستیاب ہوتا ہے

مومن کی تصویر

ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے "خواجہ محمد شاہ امرت سری کے پاس مومن خاں کی بہت عمدہ تصویر تھی نہیں معلوم اس کا کیا حشر ہوا گردن پر زلفیں پڑی ہوئیں، سر پر نوکدار کلاہ خشخاشی داڑھی، بھرپور چہرہ، کیا زمانہ تھا اور کیا لوگ تھے، غالباً اوائل کی تصویر ہوگی ورنہ سید احمد صاحب بریلوی سے بیعت کرنے کے بعد تو متشرع ہو گئے تھے۔

"مومن نہیں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم"[1]

۱۹۲۷ء

مومن کی تصویر سب سے پہلے مرزا فرحت اللہ بیگ نے رسالہ اردو اورنگ آباد بابتہ ماہ اکتوبر میں شائع کی ہے۔ انہوں نے اس تصویر کے متعلق ایک طویل نوٹ لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ تصویر خواجہ امان مرحوم نے بنائی تھی جو فرحت اللہ بیگ کے خاندان میں محفوظ تھی اس تصویر پر عبارت "شبیہ حکیم مومن خاں دہلوی بہ عہد شباب" خواجہ امان نے اپنے قلم سے لکھی تھی، اس خواجہ امانی تصویر میں مرزا صاحب نے تھوڑی سی اصلاح کی ہے جس کے متعلق لکھا ہے کہ "سر سے سینے تک جو حصہ ہے وہ اصل تصویر کا ہے البتہ طریقہ نشست کو ذرا بدل دیا گیا ہے وجہ یہ ہے کہ دہلی کے مصور تصویر کا چہرہ لاجواب بناتے تھے مگر ہاتھ پاؤں اس طرح ہوتے ہیں گویا لکڑی کے بنا کر جڑ دیئے ہیں۔ زمانہ کی تبدیلی سے اس قاعدہ کا خیال رکھتے ہوئے اس تصویر کے ہاتھ پاؤں کو اعضائے انسانی کی صورت دیدی گئی ہے بقیہ کل حصوں کو جوں کا توں رکھا ہے"[2]

میں نے مرزا فرحت اللہ بیگ کے پاس اصل تصویر اور ان کی ترمیم تصویر دیکھی ہے، میرے ایک دوست تمکین عابدی بڑے اچھے مصور تھے پنسل کاری میں تو انھیں بڑا کمال تھا چنانچہ میں نے انھیں ساتھ لیجا کر مرزا فرحت اللہ بیگ کے گھر پر بٹھا کر یہ تصویر سامنے رکھکر پنسل میں ایک تصویر بنوائی تھی جو بالکل اسی مرزا فرحت اللہ بیگ والی تصویر ہی تھی چہرے میں کوئی فرق نہ تھا ہاں زلف اور گردن کے تعویذ میں البتہ مرزا فرحت اللہ بیگ کے مشورے سے بالکل بدل دیا گیا تھا

---

[1] نقش آزاد ص ۲۶۰، [2] رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۲۷ء ص ۱۰۷ تا ۱۱۴

اور ٹوپی پر کچھ بیل بوٹے بنوا دیئے گئے تھے، اس تصویر کو فرحت اللہ بیگ نے بہت پسند کیا تھا یہ تصویر ۱۰×۱۲ سائز پر بنائی گئی تھی جس کی ایک کاپی کیمرے سے میں نے کرائی تھی اور اسی کیمرے والی ایک تصویر کو تسکین نے رنگ بھی دیا تھا، افسوس ہے کہ تسکین کی جواں مرگی کی وجہ سے ان کا ذخیرہ بھی برباد ہو گیا اور یہ پنسل کی تصویر بھی ضایع ہو گئی۔ البتہ کیمرے کی تصویر جو میرے پاس تھیں محفوظ رہیں،

یہی تصویریں میں نے مصنفین کے البم کے لئے دہلی والوں کو اور بجی پروفیسر ضیاء بدایونی کو دی تھی جو مصنفین کے البم میں اور دیوان مومن (ضیاء اڈیشن) کی طبع ثانی میں چھپی اور ان دونوں کتابوں سے بہتوں نے نقل کیا ہے، اور اب مومن کی دو ہی تصویریں نظر آتی ہیں،

ابوالکلام نے جس تصویر کا ذکر کیا ہے ممکن ہے وہ خواجہ امان والی ہی ہو،

توبہ اور ترک لباس

یوں تو بیشتر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ مومن نے سید احمد بریلویؒ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے بعد توبہ کر لی تھی مگر تفصیل کسی نے نہیں لکھی ہے اور جہاں تک ہم نے چھان بین کی ہے مومن کی توبہ کا کوئی سنہ سمجھ ہی میں نہیں آیا، کریم الدین نے اپنے تذکرہ طبقات الشعراء میں لکھا ہے "ابتدا میں تمام اوقات شعر گوئی اور لہو و لعب دنیا میں صرف کر کے تمام مزے عیاشی کے اٹھا کر اب توبہ کی بلکہ شعر ہی کہنا چھوڑ دیا ہے، مجھ پر کمال عنایت فرماتے ہیں اکثر شام کو شہر کی سیر کرتے ہیں پابند نماز و روزہ کے بھی بہ نسبت سابق کے بہت ہیں"[1]

کریم الدین نے طبقات الشعراء ۱۲۶۴ھ / ۱۸۴۷ء میں مرتب کیا ہے مگر اس سے ۱۲۶۱ھ / ۱۸۴۵ء (۲۲/رجب / ۲۹/جولائی) میں انہوں نے اپنا ایک اور تذکرہ گلدستہ نازنیناں بھی شایع کیا ہے مگر اس میں مومن کی توبہ اور شعر گوئی سے اجتناب کا ذکر نہیں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ

۱؎ طبقات الشعراء ص ۴۴۴

مومن نے جولائی ۱۸۴۵ء ۱۲۶۱ھ کے بعد اور ۱۸۴۷ء ۱۲۶۴ھ سے قبل توبہ کی۔

گویا انتقال سے دو تین سال پہلے وہ پابند ہو چکے تھے' ابو الفضل محمد احسان اللہ عباسی نے نشتر سخن کے نام سے ایک تذکرہ ۱۹۱۱ء میں مرتب اور شایع کیا ہے جس میں بغیر کسی حوالے کے انہوں نے لکھا ہے

" سید احمد بریلوی کے مرید ہوئے اور اخیر اخیر برگزیدگی میں شہرہ آفاق ہوئے " [1]

دلی کے بزرگوں سے جن لوگوں نے مومن کے متعلق سنا ہے ان کا بیان ہے کہ آخر عمر میں مومن نے ترک لباس بھی کر دیا تھا چنانچہ ظہیر دہلوی نے ترکی مرحوم اور والد ماجد سے کہا تھا کہ مومن جو بڑے شوقین اور جامہ زیب تھے آخر میں بالکل مولوی بن گئے تھے اور لباس بھی مولویوں کا سا پہنتے تھے۔

محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ "نوجوانی ہی میں مولانا سید احمد صاحب بریلوی کے مرید ہوئے کہ مولوی اسمعیل کے پیر تھے اور جو مذہب خاص اپنی کے عقائد کے بھی قائل تھے" [2]

مومن نے ۱۲۴۱ھ میں سید احمد کے ہاتھ پر بیعت کی ہے مگر بیعت کے ساتھ ہی ساتھ تائب ہونے اور ترک لباس کرنے کی روایت نہیں ملتی "کریم الدین کا بیان "اب توبہ کی ہے" صاف ظاہر کر رہا ہے کہ ۱۲۶۴ھ میں تائب ہوئے ہیں مومن نے ایک رباعی غالباً بیعت کے بعد کہی ہے ؎

مومن خلقت لباس پر مرتی ہے | سر پاؤں یہ دامن کی طرح دھرتی ہے
عمامہ ہے نو عمامہ جبہ حضرت | پیروں کی یہی وضع ہوا کرتی ہے

معلوم ہوتا ہے کہ "پیروں کی وضع" بنانے کی فکر میں انہوں نے ترک لباس بھی کر دیا مگر اس لباس میں خوش اسلوبی نظر نہیں آئی تو چیخ اٹھے ؎

مومن لازم ہے وضع مرغوب بنے | جو رنگ ہو آدمی خوش اسلوب بنے
کیا خرقہ و عمامہ ہے اللہ اللہ | جب شکل بگڑ گئی تو تم خوب بنے

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ مومن نے بیعت کے بعد توبہ نہیں کی تھی بلکہ توبہ آخر میں کی ہے جس کا ذکر کریم الدین نے کیا ہے اور ترک لباس کا بھی میں قائل نہیں ہوں کیونکہ مومن وضع دار آدمی تھے

---

[1] نشتر سخن ص ۲۱۶ ' [2] آب حیات ص ۴۳۸

ان کے جیسے پابندِ وضع کا ترکِ لباس کرنا سمجھ میں نہیں آتا۔

اس سلسلہ میں مجھے مرزا فرحت اللہ بیگ سے بھی گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا ہے ان کا خیال تھا کہ مومن نے شیفتہ کے حج کو جاتے وقت ۱۲۵۴ھ میں ان کے ساتھ ہی ساتھ توبہ کی ہے اور شاہ اسمعیل کی شہادت کے بعد ترکِ لباس کیا ہے مگر یہ بات میرے دل کو نہیں لگتی۔ بہرحال مومن کا تائب اور مجتنب ہونا تو ثابت ہے چاہے ۱۲۵۴ھ میں ہوئے ہوں یا ۱۲۶۴ھ میں مگر ترکِ لباس ثابت نہیں ہوتا۔

مومن لوگوں کی نظروں میں

"چنانچہ از مطالعہ دیوان ایشان مستفاد می شود در غزل و اصناف سخن دیگر از دو طریق یک داشتہ اند یکے عام و دیگر خاص، طریقے کہ عام است ہمیں طریقہ میر و مرزا و سائر ریختہ گویاں نامی استادان گرامی است، طریقے کہ نتیجہ طبع مبدع ایشاں و مخصوص بایشان است اگرچہ از شاہراہ عامہ دور افتادہ است اما سبب شہرت و بلند آوازگی شدہ ایشاں را در چارسوی ہندوستان بہ استادی و نازک خیالی و ذہنت آفرینی علم ساختہ"

خواجہ الطاف حسین حالی

(تقریظ دیوان قلق ص ۳۵۶)

"مومن کامل و شاعر قابل بود بری زاد ان معانی را بدام معانی صید می کرد و سخن در فارسی و ریختہ ہر دو می سرائید از شعراء نامور شاہجہاں آباد و صاحبان استعداد خداداد است و رسالے کے نامہ نگار بنام بہادر طلب علم وارد اکبر آباد گردیدہ چند ماہ بیش از رسیدم مومن رخت حیات بغزال کدہ آخرت کشیدہ بود"

نواب صدیق حسن خاں

(تذکرہ شمع انجمن ص ۴۴۸، ۴۴۹)

"شمع بزم سخنوران حکیم مومن خاں خلف الرشید حکیم غلام نبی خاں دہلوی نثراد وجہاں

استادوست عالمے از سخن جودش ثمرہا بدامن مدعا آوردہ دانا داند کہ پایۂ ریختہ از پستی بہ اوج رسانیدۂ اوست، زبانش سحر سامری نماید و بیانش گرہ دل بستگی می کشاید غزلیات او لاجواب است و مثنویات او معز انتخاب، علاوہ ازیں در فن طب دستگاہ وافر داشت واز یاری بہرہ حظ افزو با ایں ہمہ برخلاف طائفہ شعرا کہ بیشتر مشرب آزادگی و وارستگی پسندیدہ اند عقیدۂ مقبول کیش خود کردہ برجادۂ مستقیم سنت پائے عقیدت افشردہ جزاہ اللہ خیرا عنی وعن سائر المسلمین، چندے از شاہ نصیر بمشورت سخن پرداختہ ودر ۱۲۶۸ھ چراغ حیاتش افسردہ گشت از ماتم مومن خان سال وفاتش برمی آید"

سید علی حسن خاں ابن صدیق حسن خاں

(تذکرہ بزم سخن صفحہ ۱۰۷/۱۰۸)

"مومن خاں عاشق تن برشتہ طبیعت تھے اور حکمت تھے ان کے عشق مجازی کے لئے نردبان کا کام کیا تھا بڑے بڑے محلوں میں پہنچ جاتے اور اپنے نسخے چھوڑ آتے مثنویوں سے ان کے کاروبار کی حقیقت بخوبی واضح ہوتی ہے طبیعت کی وارستگی اور شوخی نے ان کے کلام میں علم کے ساتھ ضم ہو کر عجیب مزا پیدا کر دیا تھا، اور طبیعت سے اس نہانی واقعات اور واردات خاطر کو ایسے پیرایہ میں باندھ جاتے ہیں کہ دوسروں کے لئے کارے دارد، واقعی عجیب باندا ق شاعر ہو گیا ہے جرات اس رنگ کے موجد تھے مگر بسبب کم علمی کے بہت کھل گئے تھے مومن خاں کے علم نے ان واقعات کو مشکل بندش اور نرالی ترکیبوں سے ایسے پردے میں رکھا کہ ادا شناس ہی اس کے مزے کو جانتا ہے اسی سبب سے اکثر اشعار کو لوگ بے معنی بتاتے ہیں"

صغیر بلگرامی

(تذکرہ جلوۂ خضر جلوہ پنجم حصہ اول صفحہ ۲۴۰/۲۴۱)

"راقم کے زعم میں اس مزے کی طبیعت کا کوئی شاعر ریختہ گویوں میں نہیں گذرا"

ناسخ

(تذکرہ سخن شعرا صفحہ ۴۶۷)

"یہ شخص معجون مرکب تھا...... علم نجوم میں ان کو ایسا ملکہ تھا کہ دور دور تک کوئی ان کا مدمقابل نہ تھا شروع شروع عاشقی کی طرف طبیعت مائل ہوئی، تمام دیوان اُن کا عاشقانہ مضامین سے بھرا ہوا ہے، پھر جوانی ہی میں طبیعت نے پلٹا کھایا مولوی محمد اسمٰعیل کے مرشد مولانا سید احمد کے یہ مرید ہوئے اور اخیر اخیر برگزیدگی میں شہرہ آفاق ہوئے یہ شاعر کا حافظہ بہت قوی تھا، شعر پڑھنے کا انداز نرالا رکھتا تھا کسی امیر کی دربارداری کبھی نہ کی"

ابو الفضل محمد احسان اللہ عباسی

(تذکرۂ نشتر سخن صـ۲۱۶)

"شعر را بہ ادائے خوبش برمی سرائد و یکے از اساتذہ زبان اردو ست، اندراں زبان درہمہ اصناف کلام بخوش اسلوبی تمام حرف می زند، ولے دردمند و طبع دقت پسند آوردہ بود عشق برمزاجش استیلا داشت و دو آتش بہ شعلہ رخاں می سوخت و افسانہ ہائے چند در مثنویات خودش ازاں برنگاشتہ تاریخ فرا با تمیہ و تخرجہ طورے گفتہ کہ در محسنات فن معدود گردید در عنفوان شباب دست ارادت بحضرت مولانا سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ مرشد حضرت مولانا اسمٰعیل شہید دہلوی داد مسلک آں بزرگوار را بہ پایہ استوار پیمود، جناب والد مرحوم (مولوی نصر اللہ خاں صدر الصدور دہلی ثم اکبرآبادی) مومن را بہ بزرگ رادیدہ و اکثر از احوال او تذکار می فرمودند می گفتند درہمہ وقت حتی کہ درآمد و رفت ہم خالی از فکر سخن نمی بود مدام سر در جیب اندیشہ می خرامید"

محمد احسن اللہ ثاقب

(گوہرین نامہ (نظم و نثر)، صـ۱۰۷)

"مومن، درد، میر سے مضامین قلبیہ میں کم سہی لیکن ان کی غزل سرائی پر اہل دہلی بلکہ ہر دیار کے اہل مذاق کو ناز ہونا چاہیے۔"

امداد امام اثر

(کاشف الحقائق)

"حقیقت یہ ہے کہ مومن خاں نے جس قدر اسالیب بیان میں نزاکت و لطافت پیدا کر دی ہے وہ ان کی ذہانت اور جولانی طبیعت کا تماشاگاہ ہے، قصیدوں میں غزلوں میں مثنویوں میں ہر جگہ ان کا انداز بیان کیفیت سے خالی نہیں مگر افسوس ہے کہ ان کو مولانا حالی جیسا نقاد نہیں ملا جو ان کی کاوش فکر کے نتائج کو ملک میں نمایاں کرتا"

عبد الحی

(تذکرہ گل رعنا ص ۳۰۱)

"ان کی عاشقی نے ان کو جرأت کے رنگ کی طرف مائل کیا لیکن انہوں نے اس میں بھی دلی کی شان کو قائم رکھا اور نہایت متانت و تہذیب کے ساتھ عشق و ہوس کے جذبات ادا کئے"

عبد السلام

(تذکرہ شعرالہند)

"اگر میرے سامنے تمام شعراء کا کلام رکھ کر صرف ایک کے انتخاب کی اجازت دی جائے تو بلا تامل کلیات مومن اٹھا لوں گا"

نیاز فتحپوری

(ماہ نامہ نگار 'مومن نمبر' ۱۹۲۸ء)

"مومن کا کلام نازک خیالی اور بلند پردازی کے لئے مشہور ہے اور وہ صاحب طرز ہیں"

رام بابو سکسینہ

(تاریخ ادب اردو ص ۱۴۸ تا ۱۵۰)

"ہر چند زبان اردو میں تو علم یکتائی بلند ہی تھا لیکن کمال مہارت فارسی سے کوس لمن الملک کی صدا ہند سے فارس تک پہنچ کر طوطی ہند و بلبل شیراز کو

کو دم بخود کر دیا تھا"

صابر

(تذکرہ گلستان سخن ص ۴۳۹)

مومن، غالب، اور ذوق

ابتداً مومن، غالب اور ذوق سے زیادہ مشہور رہے ہیں، چنانچہ ذوق کے استاد شاہ بننے سے پہلے مومن ہی اپنے دونوں ہم عصروں میں زیادہ مشہور اور ممتاز تھے، ذوق کا تعلق قلعہ سے ہوتے ہی ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوگیا اور وہ دلی بھر میں استاد پکارے جانے لگے انکا نام سر فہرست آگیا اور دوسرے نمبر پر مومن کو رکھا گیا چنانچہ مومن کے مرنے تک دلی میں ذوق، مومن اور غالب کی ترتیب قائم تھی، مگر جب ذوق نے بھی انتقال کیا اور غالب قلعہ میں پہنچے اور استاد شاہ بن گئے تو پھر ان کا نام سرفہرست آگیا اور غالب ذوق، مومن کی ترتیب قائم ہوگئی۔

دلی میں آخری زمانے میں تین ہی استاد رہ گئے تھے، مومن، غالب اور ذوق، پہلے مومن اللہ کو پیارے ہوئے ان کے تین سال بعد ہی ذوق نے بھی جنت کی راہ لی اور صرف غالب ہی باقی رہ گئے، جو مومن کے بعد سترہ سال تک اپنی استادی کا ڈنکہ بجاتے رہے،

مومن نے یوں تو بچپن سے شاعری کی ہے مگر ابتدائی مشق کو چھوڑ کر ان کی شاعری کی ابتداء پچیس سالہ عمر سے مانی جائے تو کل مدت شاعری اٹھائیس، سال قرار پاتی ہے۔ اس اٹھائیس سالہ مدت میں سینکڑوں شاگرد مومن کے ہوئے مگر ان کے بعد چند ہی شاگرد ایسے تھے جو فارغ اصلاح اور صاحب طرز تھے جنھوں نے کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی ورنہ بیشتر شاگردان مومن نے غالب کی اور کمتر شاگردوں نے ذوق کی شاگردی اختیار کی تھی، اس طرح مومن کی محنت غالب کے کام آگئی، غالب نے تقریباً پینتالیس سال تک شاعری کی ہے کیونکہ مومن اور غالب کی شاعری قریب، قریب ایک ہی زمانے سے شروع ہوتی ہے اور مومن کے بعد ایک طویل عرصے تک جاری رہتی ہے۔ اس نصف صدی کے قریب عرصے تک غالب نے

شاعری کرکے اپنے دونوں ہم عصروں مومن اور ذوق کو نہ صرف پیچھے دھکیل دیا بلکہ تقریباً گم نام بنا دیا۔ اس کو ذوق کے شاگرد محمد حسین آزاد نے شدت کے ساتھ محسوس کیا اور اپنی پوری توانائیاں صرف کرکے آب حیات کے ذریعہ ذوق کو اچھالا۔

چونکہ مومن گلدستۂ طاق نسیان بن چکے تھے اس لئے آزاد نے ان سے قطع نظر ہی کر لیا اور آب حیات میں غوطہ دے کر ذوق کو حیات جاوید بخش دی مگر دلی پھر بھی دلی ہی تھی اور مومن بھی آخر دلی ہی کے روڑے تھے ہزاروں کی زبان پر مومن کا نام تھا اور سینکڑوں مومن کے دیکھنے والے موجود تھے۔ اس لئے چہ میگوئیاں ہونے لگیں، اور مختلف لوگوں نے مختلف توجیہیں مومن کے آب حیات سے محروم رہنے کی کیں تو آزاد نے ۱۸۹۱ء میں آب حیات کا دوسرا اڈیشن شایع کرتے ہوئے مومن کو بھی شریک کر لیا مگر یہ حصہ اس قدر روکھا پھیکا اور بے رونق تھا کہ مومن ذوق کے تحت الشعاع ہی نظر آتے رہے چونکہ آب حیات کی وجہ سے غالب کی شہرت گھٹنے اور ذوق کی اہمیت بڑھنے لگی تھی اس لئے خواجہ حالی کو خیال پیدا ہوا کہ استاد کی حمایت کرکے ان کی کھوئی ہوئی شہرت دوبارہ قائم کی جائے اور ذوق کو آزاد نے جتنا ابھارا ہے غالب کو اس سے زیادہ بلند کیا جائے چنانچہ انہوں نے یادگار غالب مرتب کی اور نہ صرف ذوق کو پس پشت ڈال دیا بلکہ مومن کو بھی اور گرا دیا۔ حالی نے اپنی پوری کتاب میں ذوق کا نام ہی نہیں لیا ہے مگر مومن کا ذکر کرنے پر مجبور تھے اس لئے دو چار جگہ بہ کراہت نام لیا بھی تو طنز اور طعن کے ساتھ غرض وہ غالب کو اچھالتے رہے اور ساتویں آسمان پر پہنچا دیا۔

دنیا میں شہرت اسی کی باقی رہتی ہے جس کا نام بار بار دہرایا جاتا رہے یا کام پیش نظر رہے، غالب اپنی لمبی عمر کی وجہ سے یوں ہی مشہور ہیں پھر شاگردوں نے بھی بار بار ان کا نام اچھالا اور خواجہ حالی نے یادگار غالب کے ذریعہ شہرت دوام دیدی۔ آنے والی نسلیں لکیر کی فقیر ہی تھیں بجنوری سے سید محمود تک اکرام سے مہر تک مالک رام سے عرشی تک سبھوں نے غالب ہی کا کلمہ پڑھنا شروع کر دیا اور غالب، مومن و ذوق پر غالب رہے،

مگر حق آخر حق ہے پروپگنڈے سے حق کو دبایا جا سکتا ہے فنا نہیں کیا جا سکتا بالآخر حق ظاہر ہو کر رہا اور لوگوں نے مومن کی طرف توجہ کرنا شروع کر دی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تینوں ہم عصر مومن، غالب اور ذوق تعمیر شاعری کے ستون تھے، انھی پہ پل پایوں

دہلی کا ایوان شعر کھڑا ہوا ہے، یہ تصفیہ کہ ان میں سے کون مقدم اور کون موخر ہے بڑا ہی مشکل بلکہ ناممکن ہے، اب دنیا بدل گئی ہے مذاق شعر و سخن بیدار ہو گیا ہے تنقیدی ذوق عام ہے ہر شخص نظر تنقید سے دیکھنے لگا ہے اس لئے اب ان تینوں استادوں کو لوگوں نے پرکھنا شروع کر دیا ہے۔

حسرت موہانی مومن ہی کے سلسلہ کے شاعر تھے ان کا ذوق اور مذاق تنقید بہت بلند تھا انہوں نے یہہ تصفیہ کیا تھا "زبان کے معاملے میں غالب کے دہلوی ہم عصروں میں استاد ذوق سب سے زیادہ محتاط ہیں اور اسی لحاظ سے ہمارے نزدیک اگرچہ بہ حیثیت مجموعی غالب ذوق و مومن سے افضل ہیں لیکن صرف اردو شاعری کے لحاظ سے ذوق کا درجہ غالب سے اور غالب کا مرتبہ مومن سے بلند ہے [1]

حامد حسن قادری نے "غالب، مومن، ذوق" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھتے ہوئے لکھا ہے۔

"غالب شاعری کے لئے پیدا ہوئے تھے اور شاعری ان کے لئے ان کے علو تخیل کا یہ عالم تھا کہ ولی سے لے کر آج تک کسی کو یہ بلندی نصیب نہیں ہوئی، مومن بھی شاعرانہ طبیعت اور عاشقانہ دل لائے تھے ان کی طبیعت میں ایک مزہ تھا اور یہ سچ ہے کہ لطافت تخیل رفعت فکر اور جدت بیان میں غالب کے بعد مومن ہی کا درجہ ہے، ذوق صرف مشاق تھے قادر الکلام تھے استاد تھے اور بس، ان کی پرواز سطح زمین سے صرف چند گز بلند ہے ماوراء السحاب وما فوق السماوات کی رسائی سے بلند تر ہیں، زبان پر ان کے بڑے احسانات ہیں لیکن حقیقت شعری ان کی ممنون نہیں وہ ان دل والوں میں نہ تھے جن کی ہر آہ مرثیہ دل اور ہر کراہ دیوان درد ہوتی ہے۔ ان کی طبیعت میں مزہ نہ تھا اسی لئے ان کی شاعری بھی بے مزہ ہے [2]

حکیم عبدالحی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے۔

"مومن کے طرز ادا میں ایک بات اور بھی ہے جس کو مولانا شبلی نے شعر العجم میں خصوصیات غالب میں بیان کیا ہے کچھ شک نہیں کہ مرزا غالب بھی ان کے ساتھ شریک ہیں مگر مومن کے یہاں یہ بات بہت نمایاں ہے کہ اکثر موقعوں پر مضمون کے بعض اجزا و چھوڑ جاتے ہیں جس سے ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے

---

[1] شرح دیوان غالب طبع چہارم صفحہ ۱۸، [2] ماہنامہ نگار لکھنؤ جون ۱۹۲۷ء صفحہ ۶۳،

یہ وہ موقع ہوتے ہیں جہاں سننے والے کا ذہن خود بخود اس جزو کی طرف منتقل ہو سکتا ہے، یہ شاعری کا ایک نازک پہلو ہے جس میں کبھی بے اعتدالی بھی پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے شعر سخت پیچیدہ ہو جاتا ہے اور اسکے سمجھنے میں کاوشِ فکر کی ضرورت پڑتی ہے" [۱]

صفیر بلگرامی نے غالب کا بیان نقل کیا ہے:

"ناسخ کے کلام نے دہلی میں آکر سب کو حیران کر دیا اور قاعدہ کے ساتھ مطلب کا واضح طور پر ادا ہونا لوگوں کو برانگیختہ کرنے لگا، یہاں تک کہ شعراء نے ادھر رغبت کی نگاہ سے دیکھا، اس وقت ہم تین شاعر با مذاق نام آور دہ تھے میں، اور مومن خان اور ذوق، ذوق نے ادھر کم رغبت کی کیونکہ ان کو اپنے مضمون ہی کے باندھنے میں دقت پڑتی تھی زبان کی طرف کب خیال کر سکتے تھے، مگر مومن خاں نے خیال کیا پہلے یہ شاہ نصیر کے شاگرد تھے شاہ نصیر کی جو طرز ہے وہ معلوم ہے مگر مومن خاں نے ان کو چھوڑ کر ناسخ کی طرز پر غور کیا اور فارسی کی تراش خراش پر توجہ کی۔ ادھر میں نے بھی غرض ہم دونوں دہلی کی طرز زبان کی ترکیب اور بندش کی درستی میں مصروف ہوئے مگر جب بہت کچھ کہہ گئے تو دیکھا کہ ہم دونوں کی طرز الگ الگ ہو گئی ہے۔ اور کوئی ناسخ سے نہ ملی، میں نے تو میر تقی میر کا انداز اختیار کیا اور مومن خاں اسی رنگ میں رہے" [۲]

محمد یحییٰ تنہا نے لکھا ہے،

"ہمارے پیش رو، ذوق کو اول غالب کو دوم اور مومن کو سوم نمبر دیتے تھے اب یہ تبدیلی ہو گئی ہے کہ غالب کو اول مومن کو دوم اور ذوق کو سوم نمبر پر رکھ دیا گیا ہے۔ [۳]

—(ختم شد)—

---

[۱] گل رعنا صفحہ ۳۰۲، [۲] جلوہ خضر صفحہ ۲۳۷، [۳] ماہنامہ جامعہ دہلی اگست ۱۹۳۶ء صفحہ ۱۱۷

39